عدد ۳ ۔۔۔ ۱۴۷ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۱ء

مضامین

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں   فی شمارہ ۴ روپے   سالانہ چندہ ۴۰ روپے

پاکستان میں   سالانہ چندہ سو روپے

چندہ بھیجنے کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس۔ ایم کالج، اسٹریچن روڈ، کراچی۔ پاکستان

دیگر ملکوں میں   ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱۰ پونڈ یا ۱۶ ڈالر

"   "   بحری ڈاک سے   "   ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر

مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوا[می] سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے جو معارف ۱۹۸۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ رو[پے]

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے [ساتھ] ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیم[ان] ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

شذرات

اتحادیوں اور عراق کے درمیان تقریباً ڈیڑھ ماہ تک جاری جنگ بعد از خرابیٔ بسیار ختم ہوگئی عراق نے کویت کے بے قصور اور غریب عوام کو جس بے رحمی سے تہ تیغ کیا تھا اور وہاں جیسی سنگدلانہ تباہی مچائی تھی اس سے کہیں زیادہ عبرتناک حشر اس کا ہوا، اس کے لاکھوں فوجی قتل ہوئے، اور قیدی بنائے گئے، تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ.

ابھی تک نقصانات کی تفصیل پوری طرح سامنے نہیں آئی ہے، لیکن یہ طے ہے کہ عراق کو نہایت ذلت آمیز شکست ہوئی اور اسے ہر طرح کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا، ان سطروں کی تحریر کے وقت وہاں بے اطمینانی بڑھنے کی خبریں بھی آرہی ہیں، بغداد بارہا شکست و ریخت کا سامنا کرچکا ہے، لیکن اس نوعیت کی تباہی و بربادی کی مثال مشکل سے ملے گی، جس کی تلافی مدتوں تک نہیں ہوسکے گی ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں۔

زمانے کے انقلابات بھی عجیب ہوتے ہیں، آج عراق کی تباہی پر اگر ایک طرف اس کے اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں اور ان کی گود میں پل کر جوان ہونے والے اسرائیل کو مسرت ہے، تو دوسری طرف خود عراق کے ان بھائیوں کو بھی خوشی ہے جو کل تک ہر موڑ پر اس کا ساتھ دے رہے تھے، يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِاَيْدِيهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ کا ایک نمونہ یہ بھی ہے فَاعْتَبِرُوا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ، آج کس کس بات کا ماتم کیا جائے؟ عراق کے قائد کی فکری و اعتقادی گمراہی، اپنوں سے اس کے کٹ جانے اور ہوش و تدبر سے عاری اس کی پالیسی کا، یا شماتتِ ہمسایہ، حکمت افرنگ سے عربوں کے دو نیم ہونے اور دام فرنگ میں پھنس کر اسرائیل کی قوت بازو بن جانے کا یا جس قوم کے افسانوں سے بوئے خوں آتی تھی، شمشیر و سناں سے اس کی دستبرداری اور طاؤس و رباب سے اس کی شیفتگی و گرویدگی اور دوسروں کی قوت و حکمت کے بل پر جوش جنوں میں اپنے ہی آشیاں کو پھونک ڈالنے کا ؎

اہل چمن بتاؤں میں کیا عالم جنوں   خود آشیاں کو آگ لگادی بہار میں

عراق گذشتہ دس برس سے برادر کشی اور ناحق خون مسلم بہانے میں مصروف تھا، قوت کے گھمنڈ میں ایران کے بعد کویت اور پھر سعودی عرب کو وہ اپنا نشانہ بنانا ہی چاہتا تھا کہ خود اس کی باری آگئی، اور وہ یہ نوشتۂ دیوار نہ پڑھ سکا کہ ع صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک ایران سے اس کی جنگ بے نتیجہ رہی، کویت پر اس کا قبضہ کھلی ہوئی جارحیت تھی اور امریکہ سے مبارزت اس کی بڑی غیر دانشمندانہ حرکت تھی جس کا وہی نتیجہ ہوا جو خودکشی کا ہوتا ہے، یہ محض خوش فہمی تھی کہ کویت کی طرح وہ امریکہ کو بھی زیر کرلے گا، اسباب و علل کی دنیا میں نہ اس طرح کے معجزات ظاہر ہوا کرتے ہیں، اور نہ حقائق لوگوں کے جذبات کے ماتحت ہوا کرتے ہیں: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهِ، عراق اپنی تباہی کا خود ذمہ دار ہے لیکن ظلمتِ ایام کی اس سازش میں غیروں کے ساتھ اپنوں کی شرکت نے نوا کو تلخ تر اور درد دل کو سوا کردیا ہے ؎

ہر کس از دست غیر نالہ می کند   سعدی از دست خویشتن کند فریاد

عربوں کیلئے بھی یہ لمحۂ فکریہ ہے، عراق کی ناکامی میں ان کی کوئی مثبت کامیابی نہیں ہے، کویت کے حصہ میں بھی کم بربادی نہیں آئی ہے اور سعودی عرب کا قرض حاصل کرنے کے لیے مجبور ہونا اور دوسروں کا دست نگر ہونا ایسی تجارت ہے جس میں اس کا سراسر خسارہ ہے، آخر مسلم ممالک حبل اللہ کو چھوڑ کر حبل الناس کے سہارے کب تک زندہ رہیں گے؟ کیا جنھوں نے عراق کو پسپا کیا ہے وہ ان کو مضبوط اور خوشحال دیکھنا پسند کریں گے؟ اگر اس جنگ میں عراق نے صرف کھویا ہی کھویا ہے تو اس سے طاکس کو ہے؟ کیا کویت اور سعودی عرب کو، یا ان کو جن کا مقصود تفریق ملل ہے؟ آج کے عربوں کے مددگار کل ان کے ساتھ بھی عراق ہی جیسا معاملہ کرسکتے ہیں ؎ .

فقل للشامتین بنا افیقوا   سیلقی الشامتون کما لقینا

(ترجمہ) ہماری مصیبت پر خوش ہونے والے ہوشیار رہیں کہ ان پر بھی جلد ہی وہ افتاد پڑنے والی ہے جو ہم پر پڑی ہے۔

پورے ہندوستان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم عرب اور دنیائے اسلام کے حالات و مسائل سے سب سے زیادہ باخبر ہیں، ان کی صدارت میں ۳ر مارچ کو مسلم انٹلکچول فورم کا ایک جلسہ خلیج کی صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لیے لکھنؤ میں ہوا، انھوں نے بتایا کہ جنگ سے اسلام کی شہرت، اس کی دعوت اور اخلاقی تعلیم کو نقصان پہنچا اشاعت دین کے کام میں رکاوٹ اور ہندوستان اور دنیا میں مسلمانوں کی رسوائی ہوئی، ہندوستان کے مسلمانوں کے شعور کی کمی اور جذباتیت کے مظاہرے پر مولانا نے افسوس ظاہر کیا، مولانا محمد رابع ندوی، مولانا جبیب ریحان ندوی اور مولوی عبیداللہ کوٹی نے بھی مسئلہ کی اہمیت بتائی، فورم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر یونس نگرامی نے تجویزیں پڑھیں جن میں کویت کی آزادی بحال ہونے پر مبارکباد، امریکی فوجوں کی واپسی، امت کی شیرازہ بندی، عربوں کو فوجی طاقت میں اضافہ کرنے اور تعیش پسندی چھوڑنے وغیرہ کا ذکر تھا، مولانا عبدالنور کی نظامت نے کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

۵ر مارچ کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت اور الہلال کی قومی اور مختلف النوع خدمات پر مذاکرہ ہوا، راقم الحروف، جناب عشرت علی صدیقی اڈیٹر قومی آواز لکھنؤ، جناب تاج الدین اشعر اڈیٹر قومی مورچہ بنارس، بنارس کے میر مسٹر ابوصالح انصاری اور وائس چانسلر پروفیسر آر۔ پی رستوگی نے بحث و گفتگو میں حصہ لیا، شعبۂ صحافت کے صدر اے۔ کے بنرجی کے خلوص اور ڈاکٹر حسین اجمل اعظمی، ریڈر شعبۂ صحافت کی سرگرمی اور لگن سے یہ مذاکرہ دلچسپ اور کامیاب رہا۔

مقالات

مولانائے روم اور ان کی مثنوی معنوی

از
مولانا محمد عبدالسلام خاں سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور

رومی کا عہد ساتویں صدی ہجری مسلمانوں کی تاریخ کا نہایت پرآشوب عہد ہے، مسلم معاشرہ افراتفری، بے چینی، خوف و ہراس اور مایوسی کا شکار تھا، روز کے خون خرابے، آئے دن سلطنتوں کا بننا بگڑنا، دن رات کا تماشا تھا، جس سر پر آج تاج ہے کل اسی سر پر ٹھوکروں کا راج ہے، پھر تاتاری سیلاب بلا عذاب الٰہی کی صورت مسلم آبادیوں کو روندتا، تہ و بالا کرتا الگ بڑھا چلا آرہا تھا۔ بلا پر بلا غالب، قحط، وبائیں، زلزلے، گویا چاروں طرف قیامت صغریٰ بپا تھی۔ شیعہ سنی فرقہ وارانہ جنون اور عوام ایک دوسرے کے خون کے پیاسے، ایک ہی باپ دادا کی اولاد تخت و تاج کے لیے برسرپیکار، ایک طرف نشاط و طرب کی محفلیں دوسری طرف آہ و بکا کی ماتمی صفیں، بے دھڑک عیش و عشرت اور بے نہایت فقر و فاقہ، سماج اخلاقی طور پر دیوالیہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا، عزتیں لٹ رہی ہوں تو شرم و غیرت کا کب تک لبادہ؟ یہ تھی ساتویں صدی۔

ان حالات میں زندگی کے متعلق رویوں کا بدل جانا، نصب العینوں میں انقلاب آجانا فطری تقاضا تھا، عمل کے بجائے بے عملی کا غلبہ، حرکت سے فرار، سکون کی تلاش، مادی اقتدار کے ایوانوں سے منھ موڑ کر روحانی عافیت کے زاویوں کی طرف رخ کرنا وقت کا اقتضا تھا۔ بادشاہوں کے قلعے خطرہ بن گئے تھے اور درویشوں کی درگاہیں مامن۔ شیوخ کی خانقاہیں عام و خاص کا مرجع بن گئیں، بزرگان حلقہ سے عقیدت، صوفی سلسلوں سے نسبت، مشائخ سے حصول برکات، پیروں سے امید کرامات عام مزاج بنتا جا رہا تھا تو تعجب کیا، طریق خانقاہی کو فروغ ہو رہا تھا تو حیرانی کیوں؟ اس گرد و پیش میں مولائے روم ایک مشہور، معزز اور صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آغوش تصوف میں پرورش پائی اور عقیدت و احترام کے ہاتھوں پروان چڑھے۔

مولائے روم کا نام و نسب اور ولادت

مولانا کا نام محمد، لقب جلال الدین، خطاب خداوندگار اور عرف مولائے روم تھا، ہندوستان میں مولانائے روم سے عام شہرت ہے۔ والد کی طرف سے صدیقی تھے، والدہ مشہور بزرگ ابراہیم ادہم کے سلسلۂ اولاد میں تھیں اور نسلاً تمیمی[1] تھیں۔ والد کا نام محمد، لقب بہاء الدین ولد اور سلطان العلماء خطاب تھا۔ بلخ کے نہایت محترم خاندان کے فرد، موقر عالم دین اور باکرامت شیخ طریقت تھے۔ عوام میں غیر معمولی اثر و نفوذ اور ملوک و امراء میں خصوصی رعب و ہیبت تھی۔

مولانا ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے، سید برہان الدین محقق ترمذی، سلطان العلماء کے خلیفہ خاص کو ان کی تربیت و تعلیم سپرد ہوئی اور بلخ کی سکونت ترک کرنے تک وہی مولانا کے اتالیق خاص رہے اور پوری توجہ سے ان کی تربیت و تعلیم میں کوشش کی۔

[1] الاعلام، از زرکلی، جلد ہفتم، تحت جلال الدین محمد بن محمد ص ۲۵۸۔

مولانا اور ان کے خاندان کی بلخ سے ہجرت

سلطان العلماء کے غیر معمولی قبول عام اور اثر و نفوذ سے خوف زدہ ہو کر علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے قلعے اور خزانے کی کنجیاں یہ کہلوا کر بھجوائیں کہ سلطنت تو درحقیقت آپ کی ہے، میرے پاس تو صرف کنجیاں ہیں۔ انھیں بھی آپ ہی رکھیے، سلطان العلماء مطلب سمجھ گئے اور کہلوا دیا کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں اور ۶۱۷ھ سے کچھ پہلے خاندان سمیت بلخ سے ہجرت کر گئے۔ نیشاپور، بغداد، حجاز، دمشق، ملاطیہ، آق شہر اور لارندہ میں رہتے بستے ۶۲۶ھ میں قونیہ میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی۔

مولانا کی تعلیم و تربیت

مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت تو محقق ترمذی کی نگرانی اور اتالیقی میں ہوئی تھی لیکن وہ بلخ سے مولانا کے خاندان کی ہجرت سے پہلے ہی جا چکے تھے، چنانچہ مولانا کی تعلیم و تربیت اب براہ راست والد سے ہی متعلق ہو گئی۔ مولانا قریب قریب ۱۵ سال والد کے ساتھ رہے، اسی سفر و اقامت کے درمیان اپنے والد سے ہی مروجہ علوم کی تحصیل کرتے رہے۔ قیام بغداد کے زمانے میں کچھ دنوں مدرسہ مستنصریہ میں بھی پڑھا[1] لیکن بغداد میں زیادہ دنوں قیام نہیں رہا اور والد کے بغداد چھوڑنے پر انھیں بھی مستنصریہ چھوڑنا پڑا اور حج کے ارادے سے یہ کارواں حجاز روانہ ہو گیا، غرض یہ کہ باطنی معارف کے ساتھ ساتھ ظاہری تعلیم بھی مولانا نے والد کی خدمت میں رہ کر حاصل کی۔

مولانا کا پہلا عقد

مولانا کا خاندان لارندہ میں قیام پذیر تھا کہ ۶۲۱، ۶۲۲ھ میں جبکہ مولانا کی عمر اٹھارہ ۱۸ سال تھی، سمرقند کے ایک باعزت، شریف اور دولت مند خواجہ،

[1] الاعلام از زرکلی جلد ہفتم تحت جلال الدین محمد بن محمد ص ۲۵۹۔

خواجہ شرف الدین سمرقندی کی صاحبزادی گوہر خاتون سے آپ کا عقد ہوگیا۔ مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے سلطان ولد محمد ۶۲۳ھ میں اور ان کے بعد دوسرے صاحبزادے علاء الدین احمد بہیں ان ہی بی بی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہاں قریب قریب سات سال مولانا مقیم رہے، غالباً اسی اثنائے سفر و قیام میں ان بی بی کا انتقال ہوگیا۔

قونیہ میں توطن

۶۲۶ھ میں یہ خاندان وسط اناطولیہ کے پہاڑی خطے قونیہ پہنچا اور یہیں مستقلاً آباد ہوگیا۔ قونیہ پہنچتے پہنچتے مروجہ علوم درسیہ کی ایک حد تک تکمیل ہو چکی تھی۔ سلطان العلما کی خواہش تھی کہ مولانا مسند درس آراستہ کریں۔

مدرسۂ خداوندگار کی بنا

مولانا کے والد کی تجویز پر بدرالدین گہرتاش وزیر دارسنے مولانا کے درس کے لیے انہیں کے نام پر مدرسۂ خداوندگار کے نام سے درس گاہ تعمیر کرا دی اور مصارف کے لیے ایک وقف بھی قائم کر دیا۔ مدرسے کے ساتھ طلبہ اور خدام کے رہنے کے لیے کوئی دارالاقامہ نہ تھا، چنانچہ مولانا کے زمانے میں وہ بھی بن گیا۔

سلطان العلماء کی وفات اور مولانا کی جانشینی

قونیہ کو وطن بنا لینے کے بعد سلطان العلما زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہنے پائے اور دو سال بعد ہی ۶۲۸ھ میں رحلت کر گئے۔ مولانا والد کی وفات کے بعد بادشاہ اور دوسرے مخلصین و مریدین کے اصرار پر والد کے جانشین نامزد کر دیے گئے اور مدرسۂ خداوندگار میں درس کے ساتھ ساتھ اب مریدین کی رشد و ہدایت اور باطنی تربیت بھی متعلق ہوگئی۔

محقق ترمذی کی قونیہ میں آمد اور مولانا کی بیعت

۶۲۹ھ میں محقق ترمذی مولانا کے اتالیق اور سلطان العلما کے خلیفۂ خاص اپنے پیر کی زیارت کے لیے قونیہ آئے لیکن

سلطان العلماء کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی زیارت تو نہ ہو سکی، مولانا اس زمانے میں لا رندہ تھے، محقق ترمذی نے مولانا کو خط لکھ کر قونیہ بلا لیا اور ان سے کہا کہ تم علوم ظاہری میں تو اپنے والد سے بڑھ گئے لیکن معارف باطنی جو تمہارے والد کا حال تھا ان کی تکمیل کے بغیر والد کے صحیح جانشین نہیں بن سکتے۔ مولانا ان کے اشارے کو سمجھ گئے اور ان کے مرید ہو کر انکی زیر تربیت معارف باطنی کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور نو سال محقق ترمذی کی مدت حیات تک ان سے اکتساب فیض کیا اور قال کے ساتھ والد کے حال کو بہم پہنچایا۔

طلب علم اور مولانا کا سفر شام

اپنی باطنی تکمیل کے ساتھ ہی ساتھ مولانا کو علوم ظاہری کی مزید تکمیل پر بھی توجہ ہوئی اور ان کی تکمیل کے لیے مولانا نے ۶۳۰ھ میں شام کا سفر کیا اور حلب کے مدرسہ حلاویہ میں رہ کر وہاں کے مختلف مدارس میں متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا، مشہور محدث و مورخ کمال الدین عمر بن احمد ابن عدیم متوفی ۶۶۰ھ سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا۔ ۶۳۱ھ میں دمشق کے مدرسہ مقدسیہ میں آگئے اور یہاں کے اساتذہ سے استفادہ کیا یہیں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، صدرالدین حموی، اوحدالدین کرمانی اور صدرالدین قونوی اکابر شیوخ سے صحبتیں رہیں۔ ۳۶-۶۳۵ھ میں قونیہ واپس آگئے اور درس و ارشاد کا سلسلہ پھر سے جاری ہوگیا۔

مولانا کا فضل و کمال، معمولات اور وضع قطع

مولانا اپنے عہد کے مشہور حنفی عالم تھے، اصل مذہب خلافیات اور فقہی جزئیات پر کامل عبور تھا، علم کلام میں ان کی مہارت پر ان کی مثنوی شاہد ہے، دوسرے مروجہ علوم میں انکی وسعت نظر مسلمہ تھی، علم حقایق میں تو وہ مجتہد مطلق تھے۔

مریدین کی تربیت و ارشاد کے ساتھ ساتھ آپ کا شغل خاص درس و تعلیم تھا،

عوام کی رشد و ہدایت کے لیے وعظ و تذکیر بھی معمولات میں داخل تھے۔ فتویٰ نویسی ان کا منصبی فریضہ تھا جس کے لیے سرکاری خزانہ سے ایک دینار روزینہ مقرر تھا اور مولانا حالت وجد میں بھی اس فریضے سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

مولانا کی عام وضع قطع عالمانہ اور مرشدانہ تھی، سر پر عمامہ، کشادہ آستینوں کی عبا لباس تھا، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، وعظ و ارشاد، درس و افتاء اور مطالعۂ کتب یہی مولانا کی زندگی تھی، سماع سے پرہیز، شعر شاعری سے بے تعلقی، وجد و حال سے بیگانگی یہ سلوک تھا، ہر عمل سے عالمانہ وقار اور مشایخانہ رکھ رکھاؤ نمایاں تھا۔ ۶۴۲ھ کے وسط تک مولانا کا یہی انداز قائم رہا۔

شمس تبریز سے ملاقات

۲۶ جمادی الاخری ۶۴۲ھ تھی مولانا مدرسے سے واپس ہو رہے تھے کہ سرائے کے چبوترے پر شمس تبریز سے اچانک ملاقات ہو گئی، کچھ متصوفانہ سوال جواب ہوئے، پھر معانقہ ہوا کہ مولانا کی حالت دگرگوں ہو گئی، عالمانہ ثقاہت، مشایخانہ وقار رخصت ہوئے، رندانہ جوش و خروش طاری ہوا، اب مولانا، مولانا نہ تھے۔ اسی حال میں مولانا انہیں ساتھ لیے گھر آ گئے اور دونوں مہینوں ایک حجرے میں معتکف رہے، احوال و مواجید کا دور شروع ہو گیا۔ اس خلوت کدے میں صلاح الدین زرکوب کے علاوہ جو محقق ترمذی کے مرید اور مولانا کے فیض یافتہ تھے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔

شمس تبریز کی صحبت نے مولانا کی کایا پلٹ دی، درس و تدریس چھوٹ گئے، وعظ و تذکیر ختم ہوئے، کتابیں دفتر بے معنی ہوئیں، تلقین و ارشاد سرمستی کی نذر ہوئے، عالمانہ اور فقیہانہ لباس اتر گیا۔ سماع و قوالی، دست افشانی، رقص و چرخ

نے معمولات کی حیثیت اختیار کر لی۔ شاعری کا فطری مذاق جو علم کے وزن اور مشیخت کے بوجھ میں دبا ہوا تھا ان کے اٹھتے ہی ابھر آیا اور غزلوں اور رباعیوں کی صورت میں نمایاں ہو گیا۔

شمس تبریز سے معتقدین کی دشمنی اور ان کا قونیہ سے فرار اور پھر آمد

ایک اجنبی سے مولانا کا یہ شغف اور اس کی صحبت کا یہ انقلابی اثر معتقدین ٹھنڈے پیٹ کیسے برداشت کر لیتے انہیں شمس تبریز سے جلن اور پھر دشمنی ہو گئی۔ شمس تبریز نے اندر اندر سلگتی اس آگ کو محسوس کر لیا اور یکم شوال ۶۴۳ھ کو خفیہ قونیہ سے نکل گئے۔ مولانا نے ان کے اچانک غائب ہو جانے کے در پردہ اسباب بھانپ لیے اور سب سے تعلق ختم کر لیا۔ یہاں تک کہ مخالفین نے اپنے کیے کی معافی مانگی اور شمس تبریز کا بھی خط آ گیا تو مولانا کو تسلی ہوئی اور مولانا نے انہیں بلا ہی نہیں لیا بلکہ اپنی پروردہ کیمیا خاتون سے عقد کر کے انہیں گھر داماد بنا لیا۔

شمس تبریز کی مستقل گم شدگی

اب گھریلو شکایتیں شروع ہو گئیں اور خود مولانا کے صاحبزادے علاء الدین محمد ان کے مخالف ہو گئے۔ سابقہ مخالفت حقیقی معنی میں ختم نہیں ہوئی تھی، ظاہری طور پر دب گئی تھی، چنانچہ گھریلو شکایتوں کو بہانہ بنا کر مخالفین ان کے قتل کے درپے ہو گئے، کیمیا خاتون کا اسی درمیان اچانک انتقال ہو چکا تھا، شمس تبریز اس گھریلو بندھن سے آزاد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۶۴۵ھ میں وہ قونیہ سے ہمیشہ کے لیے بے پتہ نکل گئے یا علاء الدین محمد کے ہاتھوں قتل ہو گئے اور مخالفین نے ان سے ہمیشہ کے لیے نجات پا لی۔

مولانا پر ان کے اس طرح بے پتہ ہو جانے کا غیر معمولی اثر ہوا حتیٰ کہ مولانا

خود بھی ان کی تلاش میں دمشق گئے لیکن بے سود، دو ایک سال تلاش و انتظار کے بعد مولانا دوبارہ دمشق پہنچے اور اب کے دمشق میں ہی رہ پڑے، آخر متعلقین و معتقدین بڑی منت سماجت سے کسی نہ کسی طرح واپس لائے۔ مولانا شمس تبریز کی روپوشی کے چالیس دن بعد سے عزاداری کا لباس تو اختیار ہی کر چکے تھے، دمشق سے واپسی کے بعد صلاح الدین زرکوب کے علاوہ سب سے قطع تعلق بھی کر لیا۔

صلاح الدین زرکوب کے خلاف شورش

اب صلاح الدین کے خلاف ہنگامہ کھڑا ہو گیا، لوگوں کو یہ سخت ناگوار تھا کہ مولانا سب سے تعلق چھوڑ کر ایک ان پڑھ ورق ساز کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں، لوگ دل گرفتہ ہوئے اور یہ دلگرفتگی آہستہ آہستہ شورش میں بدلتی چلی گئی، حتیٰ کہ لوگ صلاح الدین کے قتل کے درپے ہو گئے، مولانا کو علم ہوا تو بہت ملال ہوا اور مولانا نے سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور روپوشی اختیار کر لی، لوگ مولانا کا اتنا سخت ردعمل برداشت نہ کر سکے پھر یہ بھی اتفاق کہ اسی زمانے میں ان کے کھیتوں اور باغوں پر خشکی آنے لگی، انھوں نے اس کو مولانا کی ناراضگی کی قدرت کی طرف سے سزا محسوس کی اور سچے دل سے تائب ہوئے اور مولانا سے معافی مانگی۔ اس طرح یہ ہنگامہ فرو ہوا۔ شیخ صلاح الدین نے مولانا کے قائم مقام کی حیثیت میں رشد و ہدایت کا کام سنبھالا۔

۶۵۷ھ میں صلاح الدین زرکوب کا انتقال ہو گیا اور مولانا کی نگرانی میں تاشوں باجوں میں ان کا جنازہ اٹھا۔ مولانا کی باطنی سیر کے لیے غالباً کسی نہ کسی رفیق خاص کی ضرورت تھی، شمس تبریز کے بعد سے صلاح الدین ہی ان کے رفیق خاص رہے تھے ان کے بعد مولانا کو پھر ایک رفیق خاص کی ضرورت محسوس ہوئی۔

حسام الدین چلپی کی رفاقت خاصہ اور خلافت

مولانا نے حسام الدین چلپی کا اپنی خصوصی رفاقت کے لیے انتخاب کیا اور ان کو اپنی صحبت کے لیے مخصوص کر لیا۔ کچھ زمانے بعد ۶۶۲ھ میں انہیں خلافت بھی سپرد کر دی اور خود عبادت و ریاضت اور سماع میں مشغول رہنے لگے۔ عام وعظ و تذکیر تو شمس تبریز کی روپوشی کے بعد سے چھوٹ ہی گئی تھی لیکن نجی صحبتوں میں معتقدین و مخلصین کو پند و موعظت کا سلسلہ اب بھی جاری رہا۔ قریب قریب دس سال اسی طرح سکون و اطمینان سے گذر گئے۔

علالت و وفات

آخری دنوں میں مولانا پر ضعف و اضمحلال طاری رہنے لگا اور برابر شدت بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ آخر کے تین دن کامل خاموشی میں گذرے۔ سوائے غیر معمولی ضعف و اضمحلال کے کوئی مرض تشخیص نہ ہو سکا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں چلا، شدت بڑھتی رہی، نبض سے کسی خاص مرض کا پتہ نہیں چلتا تھا، مولانا حال نہیں بتاتے تھے اور دوائیں مفید نہیں پڑتی تھیں، وقت تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا۔

سنیچر کا دن، غروب آفتاب کا وقت، جمادی الاخریٰ کی پانچ تاریخ تھی کہ قریب قریب اڑسٹھ سال کی عمر میں سلسلۂ مولویہ کے اس بانی نے ۶۷۲ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی یا بقول مولانا نور، نور میں مل گیا اور محبت و محبوب میں بال برابر جو فرق رہ گیا تھا، دور ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

تجہیز و تدفین

دوسرے دن نقاروں، نفیریوں اور بیس جوڑی گویوں کے جلوس میں بڑی دھوم دھام سے ہر مذہب و ملت کے سوگواروں کے بے پناہ ہجوم کے ساتھ صبح کو جنازہ اٹھا اور کہیں رات تک والد کے مقبرے تک پہنچا، قاضی سراج الدین نے نماز

پڑھائی اور والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

صورت و سیرت مولانا قوی الجثہ، دراز قد اور سپید رنگ تھے، چہرہ پر وقار اور شخصیت جاذب تھی، خلیق بامروات، نرم طبع، بذلہ سنج اور فطری شاعر تھے، تکلف و تصنع سے پرہیز، اختلاط خصوصاً اہل جاہ سے طبعاً ناپسند تھا، کسب حلال کی ان کے نزدیک غیر معمولی اہمیت تھی اور زندگی میں تگ و دو کے قائل تھے۔

اہل و عیال جیسا کہ گذر چکا ہے مولانا کی پہلی بیوی گوہر خاتون سے جن کا انتقال رہتے لیتے سلطان العلماء کی حیات میں ہی ہو چکا تھا مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے بہاء الدین احمد سلطان ولد تھے جو حسام الدین کے بعد سجادہ نشین اور خلیفہ ہوئے، دوسرے علاء الدین محمد تھے جن کا والد کی حیات میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری بیوی کرا خاتون سے انکے تیسرے صاحبزادے مظفر الدین امیر عالم تھے اور ایک صاحبزادی ملکہ خاتون عرف خندولہ تھیں ان کا نکاح ایک امیرزادے خواجہ شہاب الدین سے ہوا۔ امیر عالم نے رئیسانہ زندگی بسر کی اور فقر و تصوف سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

مولانا کی معنوی یادگاریں نظم میں مولانا کا ایک ضخیم دیوان ہے جو عراقی اور حافظ جیسا نہ سہی لیکن مولانا کا حال ہے اور سرجوشی اور سرمستی کا حامل۔ رباعیات دوسرا شعری مجموعہ ہے، تیسرا منظومہ فارسی کا شہکار 'مثنوی معنوی' جو اپنے قبول عام اور پذیرائی خاص کی بدولت مجالس میں برابر متداول، مدارس میں زیر تعلیم، مواعظ کی زینت، شارحوں اور محشیوں کا موضوع تصنیف اور مولانا کے سلوک، عقائد اور کلام کا ماخذ اور سلسلۂ مولویہ کا گویا الہامی صحیفہ ہے، اس کی قرأت نے فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور مستقل پیشہ ہو گئی ہے۔

نثر میں 'مجالس سبعہ' اور 'فیہ مافیہ' مولانا کے ملفوظات کے مجموعے ہیں جو مولانا کے صوفیانہ تصورات کے اہم مصادر ہیں اور اپنی سادگی، سہولت اور بے تکلف روزمرہ کے لحاظ سے ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

مثنوی معنوی

جیسا کہ گذر چکا ہے، مولانا کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں علوم ظاہری اور معارف باطنی دونوں کا چرچا تھا اور مولانا نے دونوں سے مکمل فائدہ اٹھایا، ایک طرف وہ عالم شریعت تھے اور دوسری طرف شیخ طریقت، وہ مدرسے کے استاد بھی رہے اور خانقاہ کے پیر بھی، اپنے والد اور ان کے خلیفہ محقق ترمذی سے سلوک حاصل کیا تو شمس تبریزی کی صحبت سے جذب و مستی۔ علوم ظاہری کے لحاظ سے وہ فقیہ متکلم تھے تو معارف باطنی کے اعتبار سے سالک مجذوب۔ ان کی شاعر فطرت نے انہیں دل کو مخاطب کرنے کا سلیقہ سکھایا! مثنوی معنوی ان تمام متوافق و متضاد اثرات کا عطر مجموعہ ہے۔ اس میں جذب و سلوک، فقہ و کلام شعر کے دلنشیں پیکر میں بے تکلف اور بے تصنع روزمرہ میں تمثیلی دلائل کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کے تقدس ہی نے اس کے رواج، طرز خاص سے اس کی قرأت نے عوام میں قبول پایا اور اس کے سلوک و کلام اور دل پذیر دلائل نے خواص میں پذیرائی حاصل کی۔

مثنوی کی تصنیف کا باعث مولانا کی شاعری غزلوں اور رباعیوں تک محدود تھی۔ یہ غزلیں اور رباعیاں مولانا کے قلبی واردات اور جذب و شوق کی ترجمان ہونے کے لحاظ سے ادبی قدر و قیمت رکھتی ہیں لیکن جہاں تک ہدایت و ارشاد اور تعلیم و تربیت کا تعلق ہے قابل اعتناء نہیں۔ رشد و ہدایت کے لیے مولانا کے مریدین حکیم سنائی اور

عطار کے منظومات سے استفادہ کرتے، مولانا کے مرید خاص چلپی حسام الدین نے مولانا
سے رجوع کیا اور استدعا کی کہ وہ اپنے مریدین و مخلصین کی تربیت و ہدایت کے لیے کوئی کتاب
مرتب کر دیں مولانا نے ان کی فرمائش پر مثنوی کی طرح ڈال دی اور چھ دفتروں تک ہی
پورا کر سکے، پہلا دفتر سنہ ۶۵۸ سے سنہ ۶۶۰ تک پورا ہوا اور سنہ ۶۶۲ سے سنہ ۶۶۶ تک
بقیہ پانچ دفتروں کی تکمیل ہوئی۔

عطار اور سنائی کی مثنویاں خود مولانا کے مسلسل مطالعے میں رہتی تھیں اس لیے مولانا
کے یہاں ان کا انداز ہی نہیں آیا، بلکہ الفاظ، فقرے اور ان کے معارف وخیالات بھی آگئے۔

مثنوی کے خصوصی ماخذ

حکیم سنائی کا مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ، عطار کی منطق الطیر مولانا
کے ماخذ میں ہیں، ساتھ ساتھ شیخ برہان الدین محقق ترمذی کا سلوک بھی اسمیں شامل ہے اور
مولانا کے والد سلطان العلما کا رسالہ 'معارف بہاولہ' اور شمس تبریز کے مقالات بھی مثنوی
کے مصادر میں شمار کیے گئے ہیں۔

مثنوی کا موضوع، زبان، انداز اور فارسی ادبیات میں اسکی قدر وقیمت

مثنوی کا اصل موضوع تصوف ہے اور مقصد تعلیم و
تربیت ہے اس میں مولانا کے اجتہادات بھی شامل ہیں
اور فکری جدتیں بھی۔ لیکن منطق الطیر اور الٰہی نامہ کی طرح تصوف و تربیت ہی نہیں بلکہ ایک
حد تک مکمل شعری کلام بھی ہے جو اپنے تمثیلی استدلال کی بنا پر دماغ کے بجائے دل کو
چھوتا ہے۔

زبان کے لحاظ سے مثنوی آمد اور بے تکلف قدرت کلام کا دل پذیر نمونہ ہے،
مولانا چونکہ بقول خود معنی کے مقابلے میں الفاظ کی اہمیت کے قائل نہیں، اصل مغز ہے
پوست قابل توجہ نہیں اس لیے عامیانہ الفاظ کے صرف سے بھی پرہیز نہیں کیا ہے متنوع معانی

کا بہ یک وقت حضور کبھی تعقید و ابہام بھی پیدا کر دیتا ہے تاہم مولانا کے بے تصنع انداز،
احساس کی شدت، نظر کی گہرائی اور گیرائی نے کہیں کہیں تو مصرعوں کے مصرعوں اور
شعروں کے شعروں کو مثل اور کہاوت بنا دیا ہے۔ طبیعت کی روانی، خیالات و معلومات
کا حضور، معارف و مشاہدات کی کثرت اور مولانا کا جوش و شوق سب نے مل کر مثنوی کو
بابوں اور فصلوں میں اگرچہ مرتب نہ ہونے دیا تاہم انتشار اور بے ترتیبی کے باوجود ابتدائے
طلب سے استغراق و صحو تک، تبتل سے فنا اور وصل تک سب احوال و مقامات اور
مراحل و منازل آگئے ہیں۔ استطراد کی کثرت، کلامی بحثیں، عقائد کی تعلیم، طوالت کلام،
مضمون کے اجزا میں تفریق اور ان میں خلاف معتاد فصل وغیرہ سے اگرچہ ناگواری کا
احساس ہوتا ہے اور توجہ کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے تاہم دلچسپی قائم رہتی ہے۔ مثنوی کا بڑا
حصہ قصص و امثال پر مشتمل ہے اور کچھ ایسے قصے بھی ہیں جو سوقیت و ابتذال کی بنا پر
مثنوی کو داغدار بنا دیتے ہیں لیکن آرین مذاق کے کچھ زیادہ خلاف نہیں۔

مثنوی کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس عہد کے معاشرے اور تہذیب پر بھی
اچھی خاصی روشنی پڑ جاتی ہے۔ غرض یہ کہ مجموعی طور پر مثنوی رنگ برنگ پھولوں کا
ایک گلدستہ ہے۔

چونکہ مثنوی کے آخری پانچ دفتر طویل مدت میں تصنیف ہوئے اس لیے کہیں کہیں
ناآہنگی، اختلاف و انتشار تعجب انگیز نہیں۔ علاوہ ازیں یہ پورا زمانہ مولانا کے احوال
و مواجید اور نئے نئے معارف و مشاہدات کا ہے، واردات کے تنوع اور احوال
و مقامات کے اختلاف سے خیالات و انعکاسات میں تغیر اور فرق ازبس ناگزیر ہے۔
مثنوی میں شطحات نہ سہی لیکن مواجید تو ہیں ہی کیونکہ سپہ سالار کے بقول "انکے

اکثر کلمات طیبات بحالت سکر بیان ہوئے ہیں" اس لیے قابل گرفت نہیں اور تشریح وتاویل کی گنجائش رکھتے ہیں۔

مولانا ایک طرف اشعری متکلم دوسری طرف صاحب حال صوفی، کبھی اشعریت کا غلبہ اور کبھی حال و مقام کی سرجوشی۔ چنانچہ فکر اور واردے کا تناقض وتضاد مولانا کی اس پہلو دار شخصیت کا لازمی نتیجہ ہے۔

فارسی ادبیات میں جہاں تک مثنوی کی ادبی قدر وقیمت کا تعلق ہے یہ فردوسی کے شاہ نامے، حافظ کے دیوان غزلیات اور سعدی کی گلستاں کے پائے کی چیز ہے اور طہران یونیورسٹی کے ایرانی استاذ فروزان فر کے بقول "ایرانی ادبیات کی عظیم ترین اور بلند ترین کتاب ہے"۔

مولانا کی شخصیت کا اشعری رخ

کلامی عقائد میں حنفی علماء کا طبقاتی مسلک اگرچہ ماتریدی ہے لیکن اشعریت کا آوازہ اس بلند آہنگی سے اٹھا اور پھیل گیا کہ ماتریدیت کی شہرت ماند پڑ گئی اور اہل السنت والجماعت کے کلامی عقائد اشعریت ہی میں ڈھل گئے۔ علاوہ ازیں کہنے کو تو لوگوں نے اشعری اور ماتریدی اختلافات پچاس[۵] تک گنا دیے ہیں لیکن یہ زیادہ تر نظریاتی ہیں کہ جن کا ثمرہ اختلاف نہیں بلکہ یہ تعبیری اور تفسیری ہیں۔ دونوں مسلکوں کے اہم اختلافوں میں انسانی قدرت کا موثر ہونا نہ ہونا قضا میں تغیر وتبدل ہو سکتا یا نہ ہو سکتا، افعال کے حسن وقبح کی شرعیت وعقلیت گنے جا سکتے ہیں۔ خود مولانا کس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں، قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا، مثنوی پر عام اور سرسری نظر ڈالنے سے مولانا کا اشعری مسلک کی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے۔

اشعری عقائد

اشعری، اور ماتریدی مسلکوں کے اہم اختلاف میں نے بیان کر دیے،

اشعری عقائد مختصراً یہ ہیں: باری تعالیٰ واجب الوجود ہے، اس کی ہستی ضروری اور ناگزیر ہے، بے جہت ہے، بے مکان ہے، بے جسم ہے، نہ جوہر ہے نہ عرض، بے زمان ہے یعنی اس کی ہستی زمانے پر موقوف نہیں، بے اتحاد ہے، کسی میں حلول اور سرایت نہیں کر سکتا، وہ محل حوادث نہیں، وہ حسی اور نفسانی صفات سے متصف نہیں، وہ واحد اور اکیلا ہے۔

باری تعالیٰ قادر ہے، عالم ہے، حی اور زندہ ہے، صاحب ارادہ ہے، سمیع اور شنوا ہے، بصیر اور بینا ہے، متکلم اور با سخن ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک یہ ساتوں معانی اوصاف ہیں عین ذات نہیں اور قدیم ہیں، ذات باری نہ کبھی ان سے خالی تھی اور نہ کبھی خالی ہو گی۔

اشاعرہ باری تعالیٰ کی رویت کو دنیا اور آخرت دونوں میں ممکن مانتے ہیں لیکن دنیا میں وقوع کے منکر ہیں، جہاں تک اس کی حقیقت کے علم کا تعلق ہے، اس کے ممکن اور ناممکن ہونے میں اختلاف ہے۔

افعال عباد باری تعالیٰ کی خلق ہیں، ان میں براہ راست اور فعل کے کسی نتیجے میں پیدا ہونے والے افعال کی تخصیص نہیں، بندوں سے صرف کسب اور عمل کا تعلق ہے، وہ باری تعالیٰ کے فعل کو پیدا کرنے سے متصل اور مقارن پہلے ارادے کو کسی فعل سے متعلق کرتے ہیں اور معمولاً و عادۃً باری تعالیٰ ارادہ کیا ہوا فعل پیدا کر دیتا ہے۔

باری تعالیٰ نے ازل میں افعال و اشیا کو جس طرح، جس حال، جس وقت اور جب تک پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے ویسے ہی ان کا وجود ہو گا، تغیر وتبدل ممکن نہیں۔

افعال کی اچھائی کہ فاعل سزا وار ستائش اور مستحق ثواب ٹھہرے اور برائی کہ مرتکب لائق سرزنش اور مستوجب عقاب شمار ہو، شرع پر موقوف ہے، عقل کا منصب نہیں

کہ وہ ثواب وعقاب کا استحقاق ثابت کرے۔

خود باری تعالیٰ کے افعال حسن وقبح اور اچھائی برائی سے متصف نہیں، نہ اس کا کوئی فعل اچھا نہ برا، وہ دونوں سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کے افعال کی کوئی غرض نہیں نہ اسکیلیے ان کے نتائج منتظرہ۔

مثنوی میں مولانا نے قریب قریب ان سب ہی عقائد کو موقع بہ موقع بیان کیا ہے اور تعلیم دی ہے، جہاں ضروری سمجھا ہے تمثیلی دلائل سے ان کی توضیح کی ہے اور معقول کو محسوس کر دکھانے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے اور بہت کاوش سے محسوس مثالیں تلاش کی ہیں جو دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتی ہیں۔

مولانا کی شخصیت کا صوفیانہ رخ

عام خیال یہ ہے کہ مولانا وحدت وجود کے قائل ہیں اور ابن عربی کی پیروی میں ذات باری کو اطلاق ہی اطلاق اور سراسر ابہام، ہر وصف سے معرا حتیٰ کہ وجود وجوب کی آلودگی بلکہ معلولیت کے شوائب سے بھی منزہ مانتے ہیں، غیب الغیب کے حجاب اور خفار الخفا کے حجلے سے اس حسن ازلی کی کرنوں کا مرتبہ بہ مرتبہ تعینات وتشخصات کے لطیف وکثیف تہوں میں مستور ہو کر تنزل اور آثار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ کائناتی تعین عالی تشخص اختیار کر لیتی ہیں، ذات اطلاق وابہام کی اندھیاری سے قبائے صفات پہن کر باہر نکل آتی ہے۔ ایک وجود ہے جو اپنے تعینوں اور تشخصوں میں ہزار ہے، ورنہ واقع میں لاموجود الا ہو، وہی وہ ہے اور بس۔

اگرچہ ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ سے ایام طلب میں دمشق میں مولانا کی صحبتیں رہیں اور ابن عربی کے خصوصی شاگرد اور پروردہ صدرالدین قونوی متوفی ۶۷۳ھ کے ساتھ دوستی بھی رہی لیکن وہ وجودی وحدت کے قائل نہیں ہو سکے۔ دونوں کے مذاق

میں اتنا تفاوت تھا کہ ابن عربی کی مشہور کتاب 'فتوحات مکیہ' جو اس فکر کی گویا مفصل شرح ہے، مولانا کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

مولانا درحقیقت وجود باری اور وجود ممکن کی ثنویت اور دوئی کے قائل ہیں ان کی منزل فنا فی اللہ اور بقا باللہ ہے۔

وجود کے قائم رہتے ہوئے کسی وصف کا جانا فنا اور اس کی جگہ دوسرے وصف کا آنا بقا ہے، یہ رفت اور آمد ہے، عدم اور وجود نہیں۔ میں اس خیال کی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے صرف اسی فنا وبقا کی توضیح پر اکتفا کرتا ہوں جو مولانا اور ان کے پیش رو بزرگوں سنائی وعطار کے سلوک کی آخری منزل ہے۔

فنا سے مقصود بندے سے اوصاف بشری کا زوال اور اوصاف جلالت میں کمال ہے۔ جہاں تک بندگی کا تعلق ہے بندہ بندہ رہتا ہے، تکلیفات شرعیہ سے مکلف (الا یہ کہ جذب وسکر میں ہوش نہ رہے) اور خدا خدا رہتا ہے چنانچہ مولانا نے انکی ایسے لوہے سے مثال دی ہے جو آگ میں سرخ ہو کر اپنا رنگ کھو کر آگ کا رنگ روپ اور جلا ڈالنے کی خاصیت پیدا کر لیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فنا اور بقا کی یہ آخری منزل جس کو فنا فی اللہ اور بقا باللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اصل میں ہندی وحدت وجود کی اسلامیائی متشکل ہے اور اس کے ڈانڈے وحدۃ الوجود سے ملے ہوئے ہیں، چنانچہ یہ دونوں تصور گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور سنائی، عطار اور مولانا سب کو وجودی وحدت کا حامی سمجھ لیا جاتا ہے۔

فنا اور بقا کا یہ تصور تمام پیش بندیوں کے باوجود بشرطیکہ اس کو حقیقی اور خارجی معروضی کیفیت تسلیم کیا جائے تو عقلاً حلول واتحاد سے اس کا امتیاز بہت دشوار ہے۔

خود مولانا کو بھی اس دشواری کا احساس ہے، چنانچہ وہ اس خدشے اور خطرے پر برابر
تنبہ کرتے رہتے ہیں اور عقل کو اس حقیقت کے محسوس کرنے اور سمجھنے میں ناکارہ اور
عاجز قرار دیتے ہیں اور اس کے وراء العقل حقیقت ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

کائنات

کائنات عدم محض سے وجود میں آئی ہے اور ذات باری کے تقاضائے ظہور
کی نمود ہے۔ خیال ایزدی سے جو اپنی جگہ عرض ہے اس نے جواہر و اعراض کی صورتیں
اختیار کی ہیں، کائنات عالم اجسام یا حسی، تخیلی و عقلی حقایق پر اور عالم ارواح یا
ماوراء العقل حقایق پر مشتمل ہے۔

عالم اجسام عالم اجسام کی ساخت متضاد عناصر خاک، آب، باد اور آتش سے ہوئی
ہے۔ ان کے توازن پر یہ قائم ہے لیکن ان کا ذاتی تضاد انہیں قائم نہیں رہنے دیتا،
توازن بگڑا اور فساد آیا اور کسی دوسری ترکیب کا ظہور ہوا، کون و فساد کا یہی تسلسل عالم
اجسام کی بقا اور باری تعالیٰ کی ارادی تکوین ہے۔ مولانا کے نزدیک عالم اجسام
سارا کا سارا زندہ ہی نہیں باحس و باشعور بھی ہے، جمادات کا مطلب صرف ٹھٹھری
اور افسردہ چیزیں ہے لیکن بے حیات و شعور نہیں، ہر شے زندہ اور باشعور حقیقت ہے۔

کائنات قانون ازدواج کے تحت وجود میں آئی ہے، باری تعالیٰ کی صفت قہر
اور صفت لطف کا ازدواج اور قران یا میل ہوا اور عالم خیر و شر پیدا ہوا، پھر اس
عالم میں بھی تمام چیزیں جفت جفت اور جوڑ جوڑ پیدا کی گئی ہیں اور ان کے باہم
قران اور ازدواج سے ہی دوسری چیزیں برابر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

مولانا کے نزدیک یہ حسی کائنات ساری کی ساری بے حقیقت خواب اور سپنا ہے۔

اس کی راحتیں اور الم سب خواب کی باتیں ہیں، نہ اس کی خوشی واقعہ نہ اس کا غم حقیقت۔

عالم ارواح عالم ارواح قدیم، غیر فانی اور عالم اجسام میں متصرف اور اس کا مدبر
و منتظم ہے، عالم اجسام کی طرح اس کے اپنے الگ آسمان و زمین ہیں، اس کی اپنی بلندیاں
اور پستیاں ہیں، اس کے اپنے پہاڑ اور سمندر ہیں، اس کے اپنے حواس اور اپنے شعور ہیں
لیکن یہ سب ہمارے حواس اور شعور سے ماوراء، غیر محسوس و غیر معقول۔

جان و روح عالم ارواح کی ایک اہم حقیقت، جان و روح کے متعلق مثنوی کے
بیانات بہت الجھے اور مبہم ہیں ان سے کسی واضح اور متعین فکر کی طرف رہنمائی نہیں ملتی، ..
جان، جان جزء، جان کل، جان اول، پھر جان حیوانی، جان انسانی، جان اولیا، جان
فرشتگاں، جان انبیا اور جان محمدیؐ سب کی حقیقت ایک ہے یا الگ الگ پھر شخصی
روحیں تکثر اشخاص کے مطابق متکثر ہیں یا واحد، مدبر کل، مثنوی سے پوری طرح واضح
نہیں بہرحال اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جان مستقل جنس ہے، مادے سے مجرد، بسیط
ترکیبی تضادوں سے بری، باری تعالیٰ کے انداز کی، غیر فانی، بذات خود یا بالواسطہ علم
و آگہی، عالم اجسام سے تعلق چھوڑنے کے لیے بے چین اور اپنے عالم سے کلیۃً وصل
کے لیے بے قرار۔

عقل عالم ارواح کی دوسری خاص حقیقت عقل ہے اور مثنوی میں اس کی تفصیلات
بھی بہت مبہم ہیں تاہم یہ اپنی جگہ جنس ہے جس کے تحت جمادی، نباتی، حیوانی، انسانی،
اولیائی اور انبیائی عقلیں انواع کی حیثیت میں شامل ہیں۔

عقل کی اس نوعی تقسیم کے علاوہ دوسری تقسیم عقل جزئی یا عقل جزء اور عقل کلی
یا عقل کل میں ہے۔ اس تقسیم کی اصل نوعیت اور حقیقت کشفی ہے عقل سے ماوراء بہرحال

عقل کلی اور فرشتے کی اصل حقیقت یہی عقل ہے۔ یہ اپنی پیدائش اور ہستی میں دونوں عالم سے مقدم ہے، نہایت لطیف مستقل اور قائم، حوادث سے غیر متاثر، لب وجوہر، بایقین وایمان، قابل اعتماد، غیب بیں غیب گو ہے۔ یہ عقل وہبی ہے انسانی کسب وتحصیل کو اس میں دخل نہیں۔ پوری کائنات اس عقل کے تخیل کا حسی تشکل ہے، اس حسی تشکل نے اصل عقلی کلی کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ عقل کل حق اور واقعیت ہے اور اس کی یہ حسی صورت باطل ہے، محسوس عالم سے تعلق ختم کر دو تو اصل عقل نمایاں ہو جاتی ہے۔ عقل جزئی سے عقل کلی کا اتصال اس کو لوح محفوظ سے براہ راست استفادے کے قابل بنا دیتا ہے لیکن یہ اتصال بے طلب اور بے تقاضا نہیں حاصل ہوتا۔ اتصال کے بعد عقل جزئی کی اپنی کاواکی اور اغتشار جاتا رہتا ہے۔ عقل کلی ایک سمندر ہے اور ہماری صورتیں اس میں تیرتے طشت، جہاں یہ بھر گئے اور تہ میں غائب ہوئے۔ عقل جزئی کو عقل کلی کا حصہ مانو تو ناقص حصہ ہے، فرد کہو تو فرد ضعیف ہے۔

ارتقاء | انسان کی یہ انسانی صورت ابتدائی نہیں ارتقائی ہے، اس نے پہلے عنصر بسیط، آب وخاک، و باد وآتش کی صورت اختیار کی، بساطت سے ترکیب میں آیا، جماد ہوا، نبات ہوا، حیوان ہوا پھر انسانی صورت قبول کی، انسانیت سے کہاں جائیگا یہ کون کہہ سکتا ہے، آگے کی منزلوں کی کوئی نہایت نہیں۔ یہ تو موت تک کی منزلوں کی حالت ہے۔ موت سے اس کی ارتقائی منزلوں کا اختتام نہیں ہوتا۔ صرف راہِ وجود کی منزلیں ختم ہوتی ہیں اور راہِ عدم کی منزلیں شروع ہو جاتی ہیں۔ لاانتہا اور بے انقطاع!۔

روحانی یا باطنی حواس | انسان کے ظاہری حواس پنجگانہ تو کھلے ہوئے ذرائع حس ہیں

جن کے الگ الگ میدان عمل ہیں، اگرچہ کسی ایک حاسّے کا ضعف دوسرے حواس کو بھی ضعیف کر دیتا ہے لیکن ایک کی نیابت دوسرا نہیں کر سکتا، پھر ان کے احساس میں محسوس کا استیعاب نہیں، محسوس کے کسی مخصوص رخ پر مرکوز رہتا ہے۔

ان ظاہری حواس کے علاوہ ان کے مقابل باطنی حواس پنجگانہ انسان کو دوسرا ایزدی عطیہ ہیں اور اس کی تکریم وشرف ہیں۔ ان کی کارکردگی کی پہلی شرط جسم سے انقطاع ہے، ان میں سے ہر حس دوسری حس کی نیابت کر سکتی ہے۔ ان کے میدان عمل الگ الگ نہیں، ساتھ وسیع تر، شامل تر اور کامل تر ہیں اور ظاہری حسوں کا ارتقا نہیں بلکہ انقلاب ہیں۔ یہ حسّیں مرگ جسم سے مرتی نہیں بلکہ برابر قائم اور فعّال رہتی ہیں، یہ اتنی نازک اور دقیقہ رس ہیں کہ انبیا علیہم السلام کے نغمہائے باطنی کو بھی محسوس کر لیتی ہیں۔

علم | علم انسانی مولانا کے نزدیک تحصیل اور کسب نہیں تذکر اور پردہ کشائی ہے۔ روح سراسر علم وعرفان ہے جس پر مادے کی تاریکی کے پردے پڑے ہیں، اس سے تعلق ترک کیا اور یہ پردے اٹھے اور علم کا آفتاب طلوع ہوا اور روح اپنی حقیقی کیفیات، علم وخبرت کے ساتھ نمایاں ہوئی، ساتوں طبق اپنے بدیہیات ونظریات عملیات اور علمیات کے ساتھ روشن ہوئے۔ یہی روح کی سرشت ہے جو دھندلی اور آہستہ آہستہ بالکل تاریک پڑ گئی ہے، انبیا اسی دھند اور تاریکی کی منجھالی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

اولیاء اللہ | اولیاء اللہ کا قرآن وحدیث کا اطلاق کافی عام ہے لیکن صوفیا نے کشفی طور پر اس کا دائرہ بہت تنگ کر کے اس کو ایک مخصوص صنف میں استعمال

کیا ہے اور اب یہی استعمال عام ہے، چنانچہ مولانا کے نزدیک اس صنف کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس عالم آب وگل سے پہلے جو کچھ ہوا وہ اس کی نظروں کے سامنے ہوا، کائنات کی بود و نمود اس کا طفیل ہے، اس کے افراد اپنی جگہ اکیلے اور تنہا نہیں، وہ خود جہان ہیں، ہستی ان کے ہاتھ میں ہے اور ان کے قابو میں، وہ ایک ہزار ہیں اور ہزار ایک' ایک ہو تو ہزار، ہزار ہوں تو ایک، انکا اپنا کوئی عمل نہیں سب خدا کا عمل ہے' وہ کسی عمل کے ذمہ دار نہیں، ان کی ارواح صحرائے بے کم وکیف کی نزیل اور وسعت لامکانی میں سکونت پذیر، یہاں تو صرف ان کے تن ہیں، ان کے تن ہمہ نور و لطافت ہیں عام ارواح اور ملائک سے لطیف تر، ان کی موجودگی اور ناموجودگی انکی دانش وآگہی میں غیر موثر، غیب ان کے لیے غیب نہیں، دل میں چھپی باتیں انکے لیے ہویدا، ذات باری ان کے لیے مکشوف، مسببات اور معلولات کو ان کے اسباب وعلل سے روک دیتے ہیں، عمل اور فعل کو اس کے ناگزیر اثر سے کاٹ دیتے ہیں' چھوٹے ہوئے تیر کو واپس لے آتے ہیں، گفتہ کو ناگفتہ کر دیتے ہیں، ان کو عمل کے لیے آلات و وسائل کی ضرورت نہیں ہوتی، باری تعالیٰ کی بخششیں انکے واسطے سے ہوتی ہیں، باری تعالیٰ کی طرح ان کی بخششیں بھی بے توقع معاوضہ ہیں، وہ اگر روئیں تو ہفت افلاک چیخ پڑیں، پروردگار کی طرف سے قاصد پہ قاصد دوڑ پڑیں، ایک بار "پروردگار" کہہ دیں تو ہزار ہا لبیک کی صداؤں سے زمین آسمان گونج اٹھیں، ان کی غذا تو نور ہے ان کے ظاہری طعام میں حلت و حرمت کی تمیز نہیں، ان کے گناہ دوسروں کے ثواب سے بہتر، ان کا کفر دوسروں کے ایمان سے اعلیٰ، ان سے ناوابستگی اور سرکشی خود ان کی ناتعلقی اور ناراضگی کی دلیل ہے، اگر وہ مردہ بھی ہیں تو عالم کی زندگی ہیں، کائنات

کی دھڑکن ان کے دل کی دھڑکن ہے، ان کو کسی واسطے کی ضرورت نہیں انوار الٰہی کا وہ براہ راست مہبط ہیں، بے نہایت بارگاہ بے چوں میں ان کے مسلسل و متواتر عروج کی کوئی انتہا نہیں، یہ عروج بہ قطع مسافت نہیں یہ ایک مرحلے سے نیستی اور دوسرے بالائی مرحلے میں ہستی ہے، ان سے بحر حقیقت لا ابل رہا ہے اور خود نیست ہیں، بحر حقیقت سے انکا یہ اتصال بے چون و چگوں ہے، منطقی عقل سے ماورا، آب گینۂ کلام کی گنجائش سے باہر، اتصال کے ایک درجے میں جسم اگرچہ دکھتا ہے لیکن واقع میں وہ معدوم ہوتا ہے، اسکا سایہ نہیں پڑتا، انبیا کے مظہر ہونے کی وجہ سے یہ خود نبی ہیں، ان کی باتیں وحی الٰہی ہیں' شبہے، وہم اور غلطیوں سے محفوظ، عوام سے پردہ داری کی وجہ سے ان کی وحیوں کو وحی دل کہہ دیتے ہیں۔ لوگ ان کو بشریت کے روپ میں دیکھ کر بشر سمجھ بیٹھتے ہیں نہیں جانتے کہ یہ روپ تو اجنبیت دور کرنے کا حیلہ ہے۔ بشر تو بشر ان کو مخلوق کہنا بھی زیادتی ہے' وہ ہیں کہاں وہی وہ ہے۔ ان کو دیکھنا خدا کو دیکھنا ہے، ان کا طواف کعبے کا طواف ہے' یہ تو کعبے سے افضل ہیں، ان کی خدمت، اطاعت، حمد وثنا خدا کی خدمت، اطاعت، حمد وثنا ہے، یہ ہیں کہاں نور ایزدی انسانی جامے میں ہے۔ بندہ گیا تو کیا رہا، یہ تم سوچ لو، یہ خود اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہیں۔

خواب اور سپنا مولانا کے نزدیک سونے اور مرنے میں صرف اتنا فرق ہے کہ سونا، روح کا جسم سے وقتی قطع تعلق ہے جس میں روح کا جسم سے یک گونہ رشتہ قائم رہتا ہے، اور مرنا نامعلوم مدت کے لیے قطع تعلق ہے۔ خواب اور سپنے کی مصروفیتیں روح کی حقیقی مصروفیتیں ہیں، وہ واقعۃً چلتی پھرتی ہے، دیکھتی، سنتی، خبریں دیتی، مشورے لیتی اور دیتی ہے۔

موت موت یا روح کا جسم سے کامل ترک تعلق دنیوی اور اخروی زندگی کے

درمیان کا پل ہے اس پر سے گزرے بغیر کوئی اُخروی زندگی میں قدم نہیں رکھ سکتا، یہ خوب سے خوب تر کی طرف انتقال ہے اور برابر جاری رہتا ہے۔

صور اور اعراض کا مخزن مولانا کے نزدیک صورتیں، اوصاف اور اعراض اس عالم مادہ کی حقیقتیں نہیں، عالم مادہ یا اس عالم کثیف سے پرے ایک عالم لطیف ہے جس میں صورِ اوصاف اور اعراض جمع ہیں، مادے سے تہی اور مجرد اور بقدر ضرورت مواد مجردہ کو پہنا دیے جاتے ہیں اور وہ اجسام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لطیف عالم غیر حسی ہے اسکو محسوس کرنے کے لیے زیادہ لطیف حواس درکار ہیں اور جن میں یہ لطیف حواس ہیں وہی اس کو محسوس کرتے ہیں اور لطف لیتے ہیں بلکہ جس صورت کو چاہتے ہیں یا ضرورت محسوس کرتے ہیں لے لیتے ہیں، فرشتے یہیں سے انسانی صورتیں لے کر انسانی تشکل اختیار کرتے ہیں۔

عالم معنیٰ عالم صور کے علاوہ اور اپنی خصوصیات صوری سے جدا ایک عالم معنیٰ ہے یہ ایسی وحدت ہے جہاں موسیٰؑ و فرعون الگ نہیں۔ اس میں نہ تجزی و تعدد نہ زمان و مکان سب ایک اور ایک سب، نہ کوئی زوج نہ کوئی فرد، نہ آشتی نہ جنگ، وحدانی بحرِ بے کراں۔ اس جہان معنی کو معنی ہو کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے، یہ بیرنگی بے رنگ ہو کر ہی منکشف ہوتی ہے، یہ اتنا نازک ہے کہ الفاظ اس کی تاب نہیں لاتے۔ یہ بے رنگی اسیر رنگ ہو کر ہی من و تو، موسیٰؑ و فرعون اور خلیل و مصطفیٰ کی جکڑبندیوں میں مقید ہوتی ہے اور اب تب، ایسے ویسے اور یہاں وہاں کا امتیاز حاصل کرتی ہے۔

عالم کی اس تقسیم سے مولانا نے وجودی وحدت اور شہودی کثرت کے محل بھی متعین نہیں کیے بلکہ انہیں حسی مثالوں سے حتی الامکان قابل فہم بنانے کی کوشش کی

اور یہ مولانا کی خصوصی مقدرت بیان ہے۔ جہاں تک چون و چگون کا سوال ہے عقل کی حدوں سے اس کا ادراک بہت آگے ہے۔

ہم جنسی اور کشش مولانا کے یہاں ہم جنسی اور جنس کی ہم جنس کی طرف کشش عالمی رشتہ ہے، مادیات ہوں یا معنی کوئی سی دو چیزیں جن میں کسی نہ کسی حیثیت سے کوئی تعلق ہو وہ آپس میں ہم جنس ہیں اور ان کی یہی ہم جنسی ان میں کشش کا باعث ہے۔ حیوانی زندگی کی یک جنسی کی مثالوں کو چھوڑ کر مثلاً پرند پرند، چرند چرند، انسان انسان کہ ان کی یک جنسی واضح ہے، میں مولانا کی تخیلی یک جنسی کی کچھ مثالیں پیش کیے دیتا ہوں تاکہ اس رشتے کی وسعت، نوعیت اور اشتراک کے حقیقی اور ادعائی ہونے کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ چنانچہ جنتی اور جنت، جود و محمدت، عیسیٰؑ و ادریس اور ملائکہ، نباتات میں آب و خاک، فرعون و ہامان اور دوزخ وغیرہ سب ہم جنس ہیں۔

تضاد اور اضداد مولانا کے یہاں تضاد کی خلاقانہ اہمیت ہے۔ ہر ترکیب اضداد کی تالیف سے وجود میں آتی ہے اور اضداد کی تالیف ان کی فطری منافرت کی بنا پر انحلال و انتشار کا باعث بن کر ترکیب کو فنا کر دیتی ہے اور خالق کائنات پھر ان اضداد کو پیوست کر کے دوسری ترکیب پیدا کر دیتا ہے، اسی سلسلۂ ترکیب و انحلال اور پھر ترکیب و انحلال سے کائنات کا تسلسل و تواتر قائم ہے چنانچہ جو موجودات ترکیب سے بری ہیں وہ نہ فانی ہیں نہ متجدد، باقی ہیں اور قدیم۔

زہد و تصوف فقر و تصوف کی ابتدا اگرچہ زہد اور ترک دنیا سے ہوئی جو شروع میں مثبت اقدام تھا اور اس کی تبلیغی اور داعیانہ اہمیت تھی، عوام کی سطح پر خود کو

لاکر اور ان میں معاشی اور معاشرتی طور پر مل کر ان کی معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اصلاح میں کوشش تھی اور امداد و تعاون، خود اعتمادی، دیانت دارانہ کسب وعمل کی تعلیم تھی جو ان کی معاشی اور معاشرتی سطح سے بلند ہو کر چنداں موثر نہ ہوتی، اس کے علاوہ زہد کی اپنی ذاتی قیمت نہ تھی لیکن عہد صحابہ میں ہی کچھ بزرگوں نے خود زہد کو اپنی جگہ غیر ضروری اہمیت دینی شروع کر دی اور زہد اپنی منفی حیثیت میں اسلامی قدر و قیمت کا حامل سمجھا جانے لگا۔ یہی منفی زہد تصوف کا سکہ رائجہ قرار پایا اور اس میں عیسائیت اور بدھ ازم کی رہبانیت شامل ہوگئی، کچھ بزرگ تو اتنا آگے بڑھ گئے کہ بدھ بھکشوؤں کی دیکھا دیکھی کاسۂ گدائی لے کر گھومتے بھی[1]، یہ دور مسلمانوں کے فکری اجتہاد کا تھا چنانچہ کچھ ہی دنوں میں بھیک نے نذرانوں کی شکل اختیار کر لی اور اسلام کی مہاداۃ اور ہدایا کا لین دین یک طرفہ عطیوں کے حصول[2] میں بدل گیا اور کسب وعمل کی جگہ تعطل اور توکل اور دوسروں کی کمائی پر انحصار نے لے لی، نذرانے درویشی کا لازمہ سے بن گئے۔ مولانا نے اسلامی توکل کی توضیح کی اور کسب وعمل پر متوجہ کیا۔

کسب مال | مولانا کی صوفیانہ تعلیم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ تاہل، عیال داری، مال و دولت، املاک و امتعہ کو فقر و درویشی کے منافی نہیں جانتے اور نہ ان سے مکمل فائدہ اٹھانے کی صوفیت کے مخالف سمجھتے ہیں۔ وہ ترک و رہبانیت کو حقیقی دین داری نہیں قرار دیتے، جائز وسیلوں سے مال و دولت حاصل کر کے اپنی اور اپنے اہل و عیال کے آرام اور آسائش پر صرف کرنا دنیا داری نہیں مانتے، دینی تقاضوں سے غفلت برتنا، دوسروں کے مالی حقوق کو ہضم کر لینا، اپنے آپ کو

[1] رسالہ قشیریہ، باب الفقر ص ۱۴۹ [2] ایضاً صفحہ ۳۔

صرف دولت حاصل کرنے کے لیے وقف کر دینا، اسکو محض اپنے تعیش پر صرف کرنا اور خدا سے تعلق منقطع کر لینا یہ دنیا داری ہے۔ چونکہ اہل و عیال کی ضرورتوں کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے اور اسکے لیے مال و دولت لابد اور مال و دولت کا صحیح حصول جائز کسب پر موقوف تو کسب کی حیثیت بھی واجب شرعی کی ہو جاتی ہے۔ حرمت و حلت کا مدار مقصد پر ہے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی دلجمعی، صلاح و تقویٰ کا تحفظ، دوسروں کی کاربرآری اور دین کی حفاظت مقصد ہے تو کسب واجب، اگر مقصد انکے خلاف ہے تو کسب ناجائز۔ سچی درویشی دل کی مسکنت اور اس کا حب مال سے خالی ہونا ہے نہ کہ دوسروں کے کسب پر تکیہ کرنا اور توکل کو بہانا بنا کر خود کو معطل کر لینا۔

مولانا اور انکی مثنوی کے متعلق متضاد تاثرات | مولانا کا ایک طرف تو فقہ حنفی اور خلافیات کے مستند علماء میں شمار ہے طبقۂ صوفیہ میں وہ درجۂ اجتہاد پر فائز ہیں اور قطبیت کا مرتبہ رکھتے ہیں ان کی مثنوی کو "ہست قرآں در زبان پہلوی" کہا گیا ہے، دوسری طرف ان افکار کی بنا پر جن کی مثنوی میں تعلیم ہے انہیں فرقۂ باطینہ کے اصحاب حلول و اتحاد کے غلاۃ و متشددین میں گنا گیا ہے اور انکے اور انکی مثنوی کے ترک کو واجب قرار دیا گیا ہے[1]، اپنے معاصر علماء کی تکفیر کا خود مولانا کو بھی اعتراف ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مثنوی کے اکثر افکار کے ڈانڈے عقلاً حلول اور اتحاد سے ہی ملتے ہیں جو مولانا کو بھی مثنوی میں تسلیم ہے، پھر مریدین و معتقدین کو اپنے لیے سجدے کا حکم بھی اتحاد کی ہی طرف لے جاتا ہے۔

درحقیقت جیسا کہ گذر چکا ہے مولانا کے دو دور ہیں ایک شمس تبریز سے ملاقات سے پہلے کا اور ایک ملاقات کے بعد کا اور مثنوی کے افکار مولانا کے دوسرے دور کی مستی کی یادگار ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حوالے | یہ مقالہ "افکار رومی" کی کچھ معمولی اضافوں کیساتھ تلخیص و اختصار ہے۔ زرکلی کی اعلام اور رسالہ قشیریہ کہ جدید حوالوں کے ساتھ اسکے متن اور حوالوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

[1] الاعلام (حاشیہ)، ص ۲۵۹۔

اردو کی ایک قدیم مثنوی

"احوال قادر ولی" عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی

(۲)

نطھر نگر : نطھر نگر دراصل تروچناپلی (Tiruchchirapalli) کا پرانا نام ہے۔ یہ اس لیے اس نام سے مشہور ہے کہ یہاں نطھر ولی نام کے ایک بزرگ مدفون ہیں یہ مدراس کے ایک ضلع کا بھی نام ہے اور اس ضلع کے ایک شہر کا بھی"، دی گزیٹیر آف سدرن انڈیا" کی وضاحت کے مطابق "یہ شہر مدراس سے دو سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس کی سرحدیں شمال میں جنوبی آرکاٹ سے اور مشرق میں ضلع تنجاور سے ملی ہوئی ہیں اور اس کی مغربی سرحد سے دریائے کاویری اس ضلع میں داخل ہوتا ہے، یہاں کی نطھر صاحب (Nutter saheb) کی درگاہ اس لیے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یہاں کرناٹک (Carnatic) کے متعدد نوابوں کی قبریں بھی ہیں" یہ شہر دراصل آرکاٹ کے نوابوں کا پائے تخت رہا ہے[۱]۔

شیخ محمد اکرام نے اپنی گرانقدر تصنیف آب کوثر میں نطھر ولی اور نطھر نگر کے حالات پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے انھوں نے لکھا ہے: "جو بزرگ سب سے

پہلے ہندوستان کے بالکل جنوبی علاقے میں آئے اور اندرون ملک میں ارشاد و ہدایت کا مرکز بن گئے، ان میں سے ترچناپلی کے سید سلطان نطھر ولی جو ۱۲۲۵ء میں یعنی خواجہ اجمیری کی رحلت سے گیارہ سال پہلے وفات پا گئے، خاص طور پر مشہور ہیں، آپ کے جد امجد ممالک روم کے امراو حکام میں سے تھے، لیکن آپ کے دل میں محبت الٰہی کا جوش موجزن ہوا اور آپ نے فیصلہ کیا کہ اپنی تمام عمر یاد الٰہی اور اشاعت اسلام میں صرف کروں گا، پہلے آپ نے ایران کے شہر ہرمز میں سید علی بادشاہ جو لق خلیفہ بابا ابراہیم کی بیعت کی اور ایک مدت تک مرشد کی خدمت کے بعد اپنے رفقاء اور مریدین کے ہمراہ جن کی تعداد نو سو بتائی جاتی ہے، سعادت حج سے شرفیاب ہوئے اسی دوران میں آپ کو اشارہ ہوا کہ آپ دکن جا کر اسلام کو وہاں جاری کرو چنانچہ آپ مریدین کے ہمراہ تلنگیات تشریف لائے اور وہاں اشاعت اسلام شروع کی، اس وقت یہاں کا حاکم دسا سرا دیو نامی ایک ہندو تھا، مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے تو آپ کی اس کے ساتھ کوئی چپقلش نہ ہوئی لیکن وہ ایک بڑھیا کے بیٹے کو کسی بات پر قتل کرنا چاہتا تھا بڑھیا فریاد کرتی ہوئی آپ کے پاس آئی، آپ نے اس کے بیٹے کو پناہ دی، اس پر راجا کی آپ کے ساتھ جنگ ہوئی اور تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ اور آپ کے رفیق غالب آئے، اس کے بعد ترچناپلی تشریف لے گئے اور وہیں ۶۲۲ھ یعنی ۱۲۲۵ء میں وفات پائی، سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے کہ اضلاع مدورا اور ترچناپلی کے کئی مسلمان جنھیں راؤتھر (Ravuttars) کہتے ہیں آپ کی بدولت مسلمان ہوئے، آپ کا مزار ترچناپلی کی ایک مشہور زیارت گاہ ہے اور زائرین میں ہندو مسلم دونوں قوموں کے لوگ ہوتے ہیں، بلکہ ہندو زائرین کی تعداد مسلمانوں سے

زیادہ بتائی جاتی ہے، ایک زمانے میں مسلمانوں نے آپ کے نام پر ترچناپلی کا نام نطھر نگر رکھ دیا تھا، آپ کے مزار کے لیے ایک ہندو رانی میناکشی اور آرکاٹ کے نواب محمد علی نے جاگیریں وقف کیں، آپ کے مزار کے احاطے میں نواب محمد علی اور اس کا مخالف چندا صاحب دفن ہیں، آپ کے مزار کا گنبد چندا صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔[۱۵]

مثنوی نگار نے لکھا ہے کہ قادر ولی اور ان کے مریدوں کا یہ قافلہ نتھم سے چل کر نطھر نگر آیا، نطھر ولی کے مریدوں اور عقیدت مندوں کو ان کے آنے کی خبر ملی تو وہ ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے اور انہیں لے کر نطھر ولی کی درگاہ میں پہنچے، چنانچہ ان کا کہنا ہے :

بہ فضل حق چلا جب شاہ گئی روز   ہوا نطھر نگر میں شمع افروز
معاً نطھر ولی پاک مشرب   مریدوں سے کہا آ خواب میں تب
ولی اللہ یک آیا ہے اس جا   کرو سامانِ مہمانی مہیا
گئے پھر مل کے سب آگے گئی کوس   ملے قادر ولی سے ہو قدم بوس
بڑی توقیر اور عزت سے لائے   شرف آنے سے اسکے سب نے پائے

تنجاور : ترچناپلی کی طرح تنجاور (Thanjavur) بھی مدراس کے ایک ضلع اور اس کے ایک اہم شہر دونوں کا نام ہے، 'دی گزیٹیر آف سدرن انڈیا'، کی وضاحت کے مطابق اس کے شمال میں ترچناپلی اور جنوبی آرکاٹ واقع ہیں جنھیں نہر کولے رون (Coleroon) تنجاور سے الگ کرتی ہے، اس کے جنوب میں شیوگنگا کی زمینداری اور تونڈیمین راجا کی ریاست ہے اور اس کے مشرق میں سمندر تنجاور کے بیچ میں سے ایک نہر گذرتی ہے جو ویٹ آر (Vettar) کہلاتی

ہے، یہ نہر ناگور کے پاس جا کر سمندر سے مل جاتی ہے، اس ضلع کی چند چھوٹی بندرگاہوں کے نام ہیں، ناگاپٹنم (Nagapattinam) ٹرنکوبار (Tranquebar) مُتوپیٹ (Mutupet) تورومَلاواسِل (Toromalavasil) اور ناگور (Nagore)۔

مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی اور ان کے مرید ترچناپلی میں زیادہ دن نہیں رہے، وہاں سے چل کر وہ تنجاور آئے، تنجاور کے لوگوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا، ان دنوں تنجاور کا راجا سخت بیمار تھا، وہ قادر ولی کی آمد کی خبر سنکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بپتا سنائی، قادر ولی نے اس کے حق میں دعا کی، وہ اچھا ہو گیا، راجا نے انھیں انعام و اکرام سے نوازنا چاہا، قادر ولی نے نہ مانا، صرف اس کے ملک کی تھوڑی سی زمین مانگی جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی دن گذار سکیں اور مرنے کے بعد دفن ہوں، راجا نے کھلی اجازت دے دی، آپ اس زمین کو اپنی زمین سمجھیں اور جہاں پسند خاطر ہو وہاں بسیرا کریں۔ لکھا ہے :

وہاں سے پھر وہ مقبول الٰہی   ہوا جلد تنجاور کو راہی
کرم سے حق کے جب وہ شاہ کامل   ہوا ہے شہر تنجاور میں داخل
لگے ملنے کو واں کے لوگ آ کل   ولی حق کا بستی میں پڑا غل
تھا ان روزوں میں راجا سخت بیمار   عجب کچھ لادوا تھا اس کا آزار
سنا راجا نے جو حضرت کا احوال   ہوا دل میں نہایت اپنے خوشحال
معاً پھر بیٹھ کر ڈولی میں راجا   حضور شاہ آیا ہاتھ باندھا
گرا بے اختیاری سے قدم پہ   کہا پھر یوں زمیں پر سر کو رکھ کر

مجھے صحت عطا کر شاہ عالی	چلا مت اپنے در سے ہاتھ خالی
کہا تب شاہ مت ہو گھبرا تو	کیا ہیگا کسی نے تجھ پہ جادو
خدا کے حکم سے کرتا ہوں اب توڑ	نکل جاتا ہے تیرے تن کا سب کھوڑ
کہا خادم کو اپنے پھر بلا کر	ہے اس راجا کے گھر میں ایک کبوتر
تو اس کے نوکروں کو ساتھ لیجا	کسی ڈھب اس کبوتر کو پکڑ لا
کبوتر کو لے آئے شاہ کے پاس	اسے لے کر کے دیکھا سر و ناس
دعا پڑھ کر جو سر کی سوئی نکالا	تو نکلا آنکھ کے راجا کا جالا
نکل گئی ناتوانی اور سستی	ملی راجا کو یک دم تندرستی
کہا حضرت کے پاؤں پڑ کے راجا	مجھے تو جان بخشا دلنوازا
میں اس احسان کا بدلہ کروں کیا	مگر دیتا ہوں جو ہے ملک میرا
کہا شہ ملک مجھ کو نئیں ہے درکار	رہے تجھ کو مبارک تیرا سرکار
عقیدت تجھ کو گر پوری ہے دل سے	تو اپنے ملک سے تھوڑی زمین دے
کہ جیتے جی کروں میں اس میں بستر	مرے بعد از مری ہو قبر اس پر
کہا راجا نے میں سب اپنی بوجھ	جہاں ہووے پسند طبع واں رہو

ترواتور: (Trivatoor) گزیٹیر آف سدرن انڈیا کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موجودہ تیرپاتور (TiruppaIIur) ہی کا پرانا نام ہے، جو مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ میں واقع ہے اور اس ضلع کی ایک تحصیل ہے، یہ شہر محمد علی اور چندا صاحب اور ٹیپو سلطان اور انگریزوں کی لڑائیوں میں ان کی فوجوں کی چھاؤنی بھی رہ چکا ہے، یہاں ہندوؤں کے متعدد قدیم مندر ہیں جن میں

ایک مندر کے دروازے پر مضبوط اور بھاری لکڑی کا بنا ہوا ایک تیر (بروزن تیز، رتھ) کھڑا رہتا ہے جس میں وہ اپنی دیوی دیوتاؤں کو بٹھا کر سال میں ایک بار ایک بڑا سا جلوس نکالتے ہیں، اس تیر کو کھینچنے کے لیے ایک دو نہیں سینکڑوں آدمی لگتے ہیں، اس موقع پر وہاں ایک جترا (میلہ) بھی ہوتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں، اس شہر میں ان مندروں کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی درگاہیں بھی ہیں، جن کا ہر سال عرس ہوتا ہے،

مثنوی میں بتایا ہے کہ قادر ولی اور ان کے مرید تنجاور کے بعد عین اس جترے کے موقع پر تیرپاتور پہنچے تو مندر کے پجاریوں نے انھیں شرمندہ کرنے کی غرض سے انھیں اس تیر کے کھینچنے کی دعوت دیدی، مگر مسلمان اس امتحان میں پورے اترے، تفصیل مثنوی نگار کی زبانی ملاحظہ ہو:

وہاں سے شاہ ترواتور آیا	تھا اس بستی میں جترے کا سمایا
مچا تھا گاؤں میں جترے کا غوغا	اسی کا چو طرف غل ہو رہا تھا
پجاری جو سنے حضرت کا آنا	کہے اب اس گدا کو آزمانا
عیاں اس سے نہ ہو گی جب کرامت	مسلمانوں کو ہووے گی ندامت
یہی تجویز کر کے سارے یک بار	پجاری آ، کیے حضرت سے اظہار
برس کو کھینچتے ہیں تیر جو ہم	ہزاروں اس کو لگتے ہیں گے عالم
چلاویں گے اگر بے آدمی کے	تو ہم سب مانتے ہیں تم کو جی سے
پجاریوں سے سخن سن شاہ میراں	کیا اُس دیو کو پتھر کے فرماں
تو جلدی کھینچ اپنا تیر اے سنگ	پجاری تیرے تا ہوں دیکھ کر دنگ

ہوا جب حکم شہ بت پہ جاری — بہت حیرت کیے سارے پجاری
بزرگی شاہ کی ہریک نے بوجا — عقیدت سے لگے کرنے کو پوجا
وہاں سے گاؤں کے جب باہر آیا — ہریک جا دھان کا واں کھیت پایا
پڑھا ہے فاتحہ وہ اس جگا پر — سبب اُس کا مریداں پوچھے آکر
کہا یہ دو بزرگاں کی جگہ ہے — اسی جا دفن ان کے تئیں کیا ہے

بیرم پیٹ : یہ شہر بھی ضلع شمالی آرکاٹ میں واقع ہے اور تریاتور سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے، اس کا موجودہ نام پیرم پیٹ (Pernampet) ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تریاتور کے بعد اس قافلہ کی دوسری منزل بیرم پیٹ تھی، قادر ولی اور ان کے مریدوں نے کچھ دن وہاں بھی قیام کیا، وہاں مسجد نہیں تھی، مسجد بنوائی، لکھا ہے :

جو بیرم پیٹ کو تشریف لائے — وہاں کے لوگ سب خدمت میں آئے
لے آئے کھانا سب گھر سے پکا کر — رکھے ہیں روبرو حضرت کے لاکر
کہا اس گاؤں کے لوگاں سے سروڑ — نہیں مسجد ہے اس بستی کے اندر
بنائے ایک مسجد اُس جگا پر — کیے ہیں کام سب بہتر نہ بہتر

ترکلاچیری : اس نام کا کوئی شہر مدراس کے نقشے میں نہیں ملتا، البتہ پانڈیچیری (Pondicherry) کا علاقہ مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ سے قریب ہے، یہ دراصل پدوچیری (Puducheri) تھا جو بعد میں پانڈیچیری بن گیا، ممکن ہے اسی کا قدیم نام ترکلاچیری ہو، ہندوستان کی آزادی کے وقت یہ علاقہ فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھا، ۱۹۵۴ء میں انھوں نے ایک معاہدہ کے تحت اس کو

ہندوستان کے حوالہ کیا اور اب یہ یونین ٹیری ٹیری میں داخل ہے،

یہ قافلہ بیرم پیٹ کے بعد ترکلاچیری آیا، وہاں کے لوگ ان کی آمد کی خبر سنکر ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور تحفے تحائف ساتھ لائے، قادر ولی نے ان کے حق میں دعا کی :

ولی حق جو وہ مسجد بنائے — وہاں سے ترکلاچیری کو آئے
کیے ہیں لوگ وہاں کے آ ملاقات — لے آئے گھر سے اپنے نذر و سوغات
کیے ان سب پہ حضرت مہربانی — دیا ہریک کو گنج شادمانی

انڈومان : جزائر انڈومان و نکوبار (Andoman and Nicobar Islands) یہ جزائر خلیج بنگال (Bay of Bengal) میں واقع ہیں اور آزادی سے پہلے اور بعد دونوں ہی زمانوں میں ہندوستان کا حصہ رہے ہیں، انڈمان دو سو چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے[۲۰۰] اور نکوبار انیس[۱۹] جزیروں پر، پورٹ بلیر (Port Blair) ان کا پایۂ تخت ہے، آزادی سے پہلے یہ علاقہ کالا پانی کے نام سے مشہور تھا اور انگریز اسے اپنے سیاسی قیدیوں کو نظر بند کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے، آزادی کے بعد ان جزائر کو یونین ٹیری ٹیری (Union Territory) قرار دیا گیا[۳۳]

جغرافیائی اعتبار سے یہ علاقہ بنگال کے مقابلہ میں مدراس سے زیادہ قریب ہے اور یہاں اور لوگوں کے ساتھ ساتھ مدراس کے باشندے بھی بکثرت آباد ہیں چنانچہ ۱۹۸۹ء کے لوک سبھا کے انتخاب کے دوران میں ڈی، ایم، کے، کے صدر ایم۔ کروناندھی نے اپیل کی تھی کہ وہ ان جزائر میں کانگریس (ایس) کے امیدوار

کنداسوامی کو ووٹ دیں، جو لوگ اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔[۴]

مثنوی میں ان جزائر کا بھی ذکر ہے، مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی تری کلاچیری کے بعد اپنے مریدوں کے ساتھ انڈمان بھی جانا چاہتے تھے مگر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، البتہ بعد میں خواجہ خضر نے کشف کے ذریعے ان کی یہ تمنا پوری کر دی اور انھیں ان علاقوں کی سیر کرائی، لکھا ہے:

کسی نے تب کہا اے شاہ نیکو — کہ ہیگا انداماں نام ایک ٹاپو
وہاں حضرت سلیماں کا مکاں ہے — اور یک پارس کے پانی کا کنواں ہے
سنا جب شاہ اس ٹاپو کا مذکور — رکھا دل میں اور آیا میل ناگور

اس سلسلہ میں آگے چل کر لکھا ہے:

ارادہ تھا کہ حکم خضر نے کے — وہ پارس جل کا ٹاپو جاکے دیکھے
جناب خضر مثل فضل باری — ملا قادر ولی سے ایکباری
ولی اللہ اس کا کر کے اعزاز — کہا یوں اسے خدا کے محرم راز
کہ میں چہتا ہوں پارس جل کو جاؤں — سلیماں کے مکاں کو دیکھ آؤں
کہا تب خضر نے یہ قصد مت کر — نہیں یہ بات ہووے گی میسر
گر اس کے دیکھنے کی ہے تمنا — بتاتا ہوں کرامت سے میں وہ جا
یہ کہہ کے کشف سے ان کو بتایا — یہاں سے بیٹھے بیٹھے شاہ دیکھا

میل ناگور: مدراس کے نقشے میں اس نام کا کوئی شہر نہ ملا، شاید یہ ناگور کے قریب کوئی پرانی آبادی ہو، کیونکہ ٹامل میں 'میلے' کے معنی ہیں اوپر یا بالائی حصہ

اس طرح میل ناگور کا مطلب ہوا "ناگور کا بالائی حصہ"

مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ ترکلاچیری سے انڈمان نہ جاسکا تو تنجاور لوٹ آیا اور میل ناگور میں قیام پذیر ہوا، مثنوی کی وضاحت کے مطابق میل ناگور ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں بڑی سی ایک سنہری مسجد بھی تھی، یہاں کے تاجر بہت خوش حال تھے مگر مغرور، قادر ولی نے انھیں نصیحت کی کہ وہ سب سے خلق و مروت سے پیش آئیں، لکھا ہے:

سنا جب شاہ اس ٹاپو کا مذکور — رکھا دل میں اور آیا میل ناگور
کیا اس جا اقامت آ کے سرور — تھی بستی یک کوچک سراسر
سنہری ایک مسجد واں بڑی تھی — بڑی سوداگروں کی گڑ بڑی تھی
وہ تھے سوداگراں سب مال پرست — تھے اپنے ہاتھیوں کو دیکھ خرمست
نہیں خاطر میں لاتے تھے کسی کو — بہت مغرور تھے اور سخت بدخو
کیا حضرت نے ان کو یہ نصیحت — کہ ہر یک سے کرو خلق و مروت

ناگور: (Nagore) جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے، ناگور مدراس کے ضلع تنجاور کا ایک ساحلی شہر ہے اور تنجاور کی پانچ بندرگاہوں میں ایک اہم بندرگاہ سمجھی جاتی ہے، سدرن گزیٹیر کی وضاحت کے مطابق یہاں ایک عالی شان مسجد ہے جس کے ۹۰ فٹ بلند دو مینار ہیں، یہ مسجد اپنے ان دو خوبصورت میناروں کے ساتھ ایک تاریخی یادگار معلوم ہوتی ہے، ان میناروں کی ساخت شمالی ہند کی مسجدوں کے میناروں کے مقابلے میں چینی پگوڈوں کے طاوروں سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔[۵]

قادر ولی اور ان کے مریدوں کا یہ قافلہ اب 'میل ناگور' سے ناگور میں داخل ہوا۔

تنجاور کے راجا کو جب ان کی واپسی کی خبر ملی تو اس نے ہرکارے دوڑائے کہ معلوم کرو قادر ولی کہاں قیام کرنا پسند فرماتے ہیں، قادر ولی نے ایک خاص جگہ کی نشاندہی کی، راجا نے نہ صرف یہ کہ پوری خوشی سے وہ زمین ان کے حوالہ کردی، بلکہ ان کے لیے اسکو آراستہ و پیراستہ کرکے رشک گلستاں بنا دیا، لکھا ہے :

غرض واں سے قدم شہ نے اٹھایا — اور اس ناگور میں تشریف لایا
نہ تھی بستی کہیں واں آشکارا — تھا جنگل اور دریا کا کنارا
پسند آئی جگہ وہ شاہ دیں کو — اتر کر واں دیا عزت زمیں کو
خبر لینے کو تنجاور کا راجا — کئی پوشیدہ ہرکارے رکھا تھا
کہا حضرت کو جو جاگا پسند آئے — شتابی پاس میرے خبر لائے
کہے ہرکارے جا راجا سے یہ طور — معاً خود دوڑتا آیا ہے فی الفور
کہا سب ملک میرا ہیگا حاضر — جو چاہو لیو وہ اے شاہ قادر
کہا شہ ملک لے کر کیا کروں سب — یہاں اب بسترے کی دے جگا اب
معاً راجا نے کٹوا وہاں کی جھاڑی — لگایا جھاڑ کی سب پھول باڑی
ولی حق خوشی سے واں اتر کر — نشان اپنا چڑھایا اس جگہ پر
ہوئی وہ سرزمیں سب رشک گردوں — لگا نقارہ بجنے شہ کا دوں دوں
لگا ہونے ولی کا واں ظہورا — سفر مہ کا ہوا اس دن سے پورا

وانجور، ناگ پٹن اور دھناسری: جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس کے آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے قادر ولی کے دوبارہ تنجاور آنے اور ناگور کو اپنی آخری قیام گاہ بنا لینے کے بعد ان کا زندگی بھر کا سفر گویا ختم ہو گیا مگر بعد کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی ایک جگہ مستقل طور پر نہ رہ سکے، دور دور کا

سفر تو یقیناً ختم ہو چکا تھا مگر قریب کے علاقوں کا سفر پھر بھی جاری رہا۔ ان کے اس مقامی سفر کے سلسلے میں جن جگہوں کے نام ملتے ہیں ان میں وانجور، ناگ پٹن اور دھناسری قابل ذکر ہیں۔

ان علاقوں میں وانجور اور دھناسیری کے نام مدراس کے نقشے میں نہیں ملتے۔ یا اب ان کے نام بدل گئے ہیں یا وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ان نقشوں میں ان کی نشاندہی نہیں کی گئی، صرف دھناسری کے متعلق خود مثنوی سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی البتہ ناگ پٹن (NagapaTTinam) کا نام ان نقشوں میں جلی حرفوں میں ملتا ہے اور جیسا کہ ہم نے تنجاور کے تعارف کے سلسلہ میں اوپر بیان کیا ہے، ناگ پٹن تنجاور کی پانچ چھوٹی بندرگاہوں میں سے ایک ہے اور ناگور کے قریب ہی واقع ہے، علاوہ ازیں وہ ضلع تنجاور کی ایک تحصیل ہے اور ناگور اسی تحصیل میں شامل ہے، ان علاقوں کے سفر کے بارے میں مثنوی میں جو تفصیل ملتی ہے وہ حسب ذیل ہے :۔

یکایک شاہ کا آیا ارادہ — کہ ندی پار جاؤں پا پیادہ
گیا وانجور کو خود آپ فی الفور — کھدایا ایک گڑھا واں قبر کے طور
معاً اس غار میں جوں مال بیٹھا — خوشی سے اسکے اندر چال بیٹھا
کئی دن تک رہا واں بے خور و خواب — صفائے دل سے مثل چشمۂ آب
کیا ایک روز یہ خواہش کہ یاں سے — دھناسیری کو جانا جسم و جاں سے
بتائے تا کرامت واں وہ سالار — اکیلا ناگ پٹن پہنچا وہ ایک بار
یہ رتبہ صاحب اقبال کا ہے — ولی و قطب اور ابدال کا ہے

جہاں چاہیں وہ یک دم میں چلے جائیں   گھڑی میں کچھ کا کچھ قدرت کو تبلائیں

سفر آخرت: مثنوی کی وضاحت کے مطابق دھناسری گویا ان کی آخری قیام گاہ تھی، وہاں وہ کئی دن دین اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، مقامی راجا اور اس کی رعایا کو مشرف بہ اسلام کیا، مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان مسجدوں میں ذکر و فکر اور خدا کی عبادت کا انتظام کیا، اس طرح جب ان کا مشن پورا ہو گیا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے تو اب ان کا صرف سفر آخرت باقی رہ گیا، چنانچہ بہت جلد وہ گھڑی بھی آپہنچی اور ایک دن وہ صبح ہوتے ہوتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مثنوی نگار کا بیان ہے:

جہاز یک دم وہاں سے پھر ہوا سا   دھناسیری کے آبندر کو پہنچا
ولی اللہ بن کر جوں قلندر   گئے یک بار اس بندر کے اندر
جو اس بستی میں پہنچا شاہ آکر   تہاں سب گر پڑے ہیں تھرتھرا کر
ہوا حضرت کا واں پھر شہرہ یکبار   لگے آنے کو اندھے لنگڑے بیمار
شفا پانے لگے اس کی دعا سے   ہوئے نزدیک اپنے مدعا سے
ہوئے محکوم اسکے با دل و جان   مسلماں ہو گئے راجا و پردھان
بنائے ہیں مساجد جا بجا پر   گئے آراستہ اسلام کا گھر
لگی ہونے صلوٰۃ و صوم ہر دم   ہوئے تکبیر کے مشغول باہم
لگا واں وعظ کہنے صبح اور شام   سکھایا سب کو دینداری کے احکام
کہا یک روز ان سب کو بلا شاہ   کہ کل ہے موت میری انا اللہ
قضا را صبح کو پھر مر گیا وہ   دلوں پر داغ ماتم دھر گیا وہ

رحلت کی تاریخ: مثنوی نگار نے قادر ولی کے اس آخری سفر کی تاریخ ۹۷۸ھ

بتائی ہے اور لکھا ہے کہ رحلت کے وقت ان کی عمر ۷۸ سال کی تھی، اس سلسلہ کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:

نکل کر تن سے اسکے روح اطہر   گئی فردوس میں مسکن مقرر
رہا جا سرور لولاک کے پاس   گیا ہے اپنے جد پاک کے پاس
تھے سن نو سو پہ ستر اس پہ آٹھ اور   کہ جنت کو گیا سالار فی الفور
ہوئی تھی پوری اٹھ سٹھ عمر والا   نہیں اس بات میں کچھ شبہ اصلا
تھا آخر کا مہینہ جمعہ کی شب   دہم تاریخ تھی اس چاند کی تب

درگاہ اور عرس: مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق قادر ولی کی درگاہیں تین جگہ ہیں، دھناسیری، ناگور اور وانجور اور تینوں ہی جگہ ان کا عرس ہوتا ہے، دھناسیری اور ناگور میں بڑے پیمانے پر اور وانجور میں ذرا چھوٹے پیمانہ پر لکھا ہے:

دھناسیری کے لوگاں اس جگہ پر   بنائے ہیں بڑی درگاہ بہتر
ابھی تک عرس وہاں ہوتا ہے ہر سال   وہاں بھی ہے سدا ناگور کا حال
ہے جو وانجور میں چلہ کی جاگا   وہاں بھی تھوڑا سا ہوتا ہے میلا

جانشینی: قادر ولی نے زندگی بھر شادی نہیں کی، جب کبھی کسی نے ان کے سامنے ان کی شادی کا مسئلہ رکھا تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ

نہ دو تکلیف شادی کی مجھے اب   نہیں اس بات سے کچھ مجھکو مطلب

البتہ ان کے قیام لاہور کے زمانے میں جب ایک خدا ترس اور دیندار جوڑا ان کے پاس آیا اور اپنے بے اولاد ہونے کا دکھ ظاہر کیا تو قادر ولی نے ان کی اولاد کے لیے دعا کی اور یہ شرط رکھی کہ تم اپنے پہلے لڑکے کا نام یوسف رکھنا اور اس کو میرے

حوالے کر دینا، میں اس کو اپنے لڑکے کی طرح پالوں گا اور اپنا جانشین بناؤں گا اور ایسا ہی ہوا، جب ان دونوں کے پہلا لڑکا ہوا تو انھوں نے اس کا نام یوسف رکھا اور پال پوس کر ذرا بڑا کرنے کے بعد قادر ولی کے حوالہ کر دیا، شاہ یوسف قادر ولی کے سفر حج کے زمانہ سے لے کر ان کی زندگی کے آخری لمحات تک انھیں کے ساتھ رہے اور انھیں کے زیر تربیت رہے اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں شاہ یوسف کو اپنا خلیفہ بھی بنا دیا تھا، مثنوی نگار کی زبان میں قادر ولی نے شاہ یوسف سے کہا تھا :-

خلیفہ اور وارث میرا تو ہے تو ہی پیچھے میرے اور روبرو ہے

اور قادر ولی کی وفات کے بعد خواجہ خضر نے اس پر اپنی مہر تصدیق یہ کہہ کر ثبت کر دی کہ :

وہی تو ہی ہے اس قطب زماں کا ہے اب تو جانشیں اسکے مکاں کا

شمال و جنوب کو جوڑنے والی ایک کڑی

اور ہم نے قادر ولی کے حالات زندگی اور ان کے تبلیغی سفر کے بارے میں جو کچھ اس مثنوی کی مدد سے لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قادر ولی کا بچپن مانک پور میں گزرا، جوانی گوالیار اور لاہور میں، درمیانی حصہ حجاز کی مقدس سرزمین پر اور آخری زندگی مدراس کے گرد و نواح میں' اس طرح وہ شمالی ہند میں پلے بڑھے تو جنوبی ہند میں مرے اور دفن ہوئے، ہندوستان کے شمال و جنوب نہ صرف آب و ہوا اور موسم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، ان کے طور طریقے اور انکی زبانیں بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں، اسی لیے سفر حج سے واپسی کے بعد جنوبی ہند کے

آخری سرے پر، ناگور جیسی ایک انجانی بستی میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے سے پہلے انھیں کافی سوچنا پڑا اور آخر خواجہ خضر کی یقین دہانی پر وہ ہمیشہ کے لیے وہیں مقیم ہو گئے اور دین اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے۔ اس طرح وہ ایک ایسی مضبوط کڑی بن گئے جو شمال کو جنوب سے جوڑتی ہے، مثنوی نگار نے قادر ولی کے اس تردد اور خواجہ خضر کی یقین دھانی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

کہا تب خضر حکم خالق رب ترے حق میں ہوا ہے اس طرح اب

کہ تو دائم رہے اس سرزمیں پر کیا ہے قطب تجھ کو یاں کا داور

یہی تیری سدا رہنے کی جا ہے یہ تیرے دفن ہونے کی جگہ ہے

کہا شہ ہے وطن میرا بہت دور کہا یورپ کہاں صحرائے ناگور

ہے یاں کے لوگوں کی چال اور زبان اور بنے گی ان سے صحبت مجھ کو کس طور

مرے بعد آویں گے یہ کیا مرے کام رہے گا کس طرح ان سے مرا نام

کہا تب خضر نے اے شاہ میراں ترے سب کام کا حق ہے نگہباں

ہے وہ والی ترا جیتے موے پر کرے گا حق ترے سب کام بہتر

یہاں ہر سال ہوگا عرس تیرا ترے در پہ رہے گا سب کا پھیرا

زیارت کو تری یاں آئیں گے سب تری درگاہ سے پاویں گے مطلب

ناگور اور تروپتی کا موازنہ : موجودہ اندھرا پردیش کے ضلع چتور (ChiTToor) میں ایک شہر ہے (TirupaTi) یہ شہر ٹامل ناڈو کے شمال مغرب میں واقع ہے اور ہندوستان کی لسانی تقسیم سے پہلے صوبہ مدراس کا ہی ایک حصہ تھا، یہ شہر اپنے تروملے (Tirumalay) کی پوتر پہاڑیوں پر واقع وینکٹیشور مندر

کے لیے مشہور ہے ہر سال لاکھوں ہندو اس کا درشن کرتے ہیں[۶] ناگور اور تروتی کا موازنہ ملاحظہ ہو۔

ہے کرناٹک میں قریہ ترپتی کا	جہاں پوجا ہے ہر وقت جمن جتی کا
کہا واں یک مسلماں سے پوجاری	عجب اس دیو کا ہے فیض جاری
مراد خلق یاں ہوتی ہے حاصل	بہت ہر یک کو ہوتا ہے محاصل
ہے ادنی یہ کرامت آشکارا	کہ نئیں اس جا مسلماں کا گذارا
مسلماں گر کیا واں جانے کا دھیان	تو مکھیاں کاٹتے ہیں اسکو اس آن
تمہارے پیر کی ہے ایسی درگاہ	اگر ہے تو کرو ٹک مجھ کو آگاہ
مسلماں نے جواب اسکو دیا یوں	کہ بیجا بات تو بکتا ہے اب کیوں
نہیں دیکھا سنا شاید لے ناداں	جو ہے درگاہ میں ناگور کی شان
ہے وہ درگاہ بے شک جاگتی جوت	بنے موتی وہاں گر آوے ہے بوت
اُسے ہندو مسلماں مانتے ہیں	سب اس کو اپنا قبلہ جانتے ہیں
سراسر نور ہے وہ اور یہ خاک	چہ نسبت خاک را با عالم پاک
وہ ہندو اس سخن سے کر کے انکار	لیا جھٹکے سے گردن پھیر یک بار
ہوئی اس وقت منڈیا اسکی ٹیڑھی	رگوں کی پھر گئی گردن میں سیڑھی
نپٹ ہو گا برا وہ بے حیا تب	لگا ہے عاجزی سے کہنے اس ڈھب
مجھے اے صاحب ناگور بخشو	کرو آزار میرا دور بخشو
دعا مانگا جو توبہ کر کے بادل	خدا اس کو کیا آسان مشکل

حوالے

۱۔ GAZETTEER OF SOUTHERN INDIA, MADRAS, 1955, P.-343.

۲۔ شیخ محمد اکرام: آب کوثر فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۵۷-۵۸

۳۔ READERSDIGEST, UNIVERSAL DICTIONARY 1988, P.-66.

۴۔ NEWS ITEM, TIMES OF INDIA, BOMBAY, NOVR: 16. 1989.

۵۔ GAZETTEER OF SOUTHERN INDIA, MADRAS, 1855, P-345.

۶۔ CYCLOPEADIA OF INDIA PT: II.

یوگ واششٹھ کے فارسی اور اردو تراجم

از جناب رام لعل نابھوی، نابھا، پنجاب

یوگ واششٹھ سنسکرت کی ایک بہت پرانی تصنیف ہے۔ یہ ضخیم گرنتھ ہے۔ اسے یوگ واششٹھ مہارامائن اور یوگ واششٹھ آتم بودھ مہارامائن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف فلسفوں کو بیان کرتی ہے۔ کچھ لوگ کرم کو پردھان مانتے ہیں اور کوئی گیان کو اور کوئی اپاسنا کو۔ اس گرنتھ میں کرم اور گیان دونوں کو پردھان مانا گیا ہے۔ اسے چھ پرکرنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) بیراگ پرکرن (۲) مچھ پرکرن (۳) اتپت پرکرن (۴) استھت پرکرن (۵) اپشم پرکرن (۶) نروان پرکرن

بیراگ پرکرن میں رامچندر جی کے پرشن ہیں ممکشو پرکرن میں شک نرمان ہی کہا ہے۔ اتپت پرکرن میں آٹھ اتہاس ہیں استھت پرکرن میں چار اتہاس ہیں اپشم پرکرن میں ۱۱ اتہاس ہیں۔ نروان پرکرن میں ستائیس اتہاس ہیں۔ یعنی چاروں پرکرنوں میں کل پچاس اتہاس لکھے گئے ہیں۔

اسے مہرشی والمیک نے سنسکرت میں لکھا۔ مختلف مہرشیوں کے خیالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس گرنتھ کے تراجم مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ فارسی اور اردو میں قلمی نسخے اور چھپے ہوئے نسخے دور دراز جگہوں پر ملتے ہیں۔ نیچے نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔ مسلمانوں نے یہاں بھی اپنی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔

فارسی میں یوگ واشسٹھ

نمبر شمار	نام یوگ واشسٹھ / ترجمہ	نام مصنف / مولف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	تاریخ تالیف / سال کتابت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	ترجمہ جوگ باشسٹ	ابوالفضل	مخطوطہ		×	۳۱۵	۱۴×۹-۲۲×۱۵ c.m		یہ نسخہ قلمی بہ نمبر ۱۸۸ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے دیکھئے کیٹلاگ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری I ۷۵ پارٹ دوئم جیب گنج کلکشن صفحہ ۱۹۵
۲	ترجمہ جوگ باشسٹ	پنڈت کشمیری	مخطوطہ		×				یہ قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے فہرست خطی فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان جلد چہارم صفحہ ۲۱۴۹ تفصیل نیچے درج ہے۔ ۳۸۹۴۔ جوگ باشسٹ متن اصلی از پنڈت کشمیری عرفان کونستیک ہندی ست دن، ک، پس ازاین) ترجمہ از فرلی (۱۵۵۶۔۱۶۰۶ام) آغاز: حمد و سپاس مر مبدی را کہ عالم را از زاویہ نیستی بہ صحرای ہستی آورد ۱۱۶۳۲۔ لاہور، کتابخانہ عمومی پنجاب ۵۱۔۲۹۴ جوگ فر:

نمبر شمار	نام یوگ واشسٹھ / ترجمہ	نام مصنف / مولف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	تاریخ تالیف / سال کتابت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
									نستعلیق، کمال الدین، تاریخ یاد نشدہ، آغاز برابر نمونہ، در فہرست مترجم فرلی یاد شدہ، ۱۷۹، اک ۳۶۹س، عباسی: ۲۴)
۳	ترجمہ جوگ باشسٹ	دارا شکوہ	مخطوطہ	–	*	×	×	منثور	یہ قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھیے صفحہ ۲۱۴۹ فہرست مخطوطات فارسی ایران و پاکستان مرکز تحقیقات فارسی۔ جلد چہارم تفصیل نیچے درج ہے۔ ۳۸۹۵ ترجمہ جوگ باشسٹ متن ہمان، ترجمہ بہ آنچنانکہ ریو (۱: ۶۱) نوشتہ از حبیب اللہ (کہ نامش در نسخہ ہای زیر نیامدہ است) بہ دستور شاہزادہ دارا شکوہ (م ۱۰۶۹ھ/ ۸-۱۶۵۹ام) بہ سال ۱۰۶۶ھ/ ۶-۱۶۵۵ام۔ در دیباچہ می نویسد: کہ بیش از این کتاب بشست ترجمہ شدہ بود اما وی

کیفیت

درکار خود واژه های سانسکریت و تمثیلات را بیشتر توضیح داده است، و گفته های دانشمندان و پیشوایان هند را نیز در آن جای داده است در نسخه گنج بخش (۱۴۹۰) این مطلب را چنین بیان می کند، که در شهور ۱۰۶۶ھ، شاهزاده دارا شکوه، دستور داد و این کتاب را در حضور ما ترجمه کند، و سخنان هر طائفه را طبق تحقیق ما، که در اکثر مواضع تقریر کنیم تسوید نمایند، یکی از حاضران به این خدمت پرداخت،

در شش "پرکرن": ۱- بیراگ (وحشت و نفرت از رسوم و عادات اهل عالم) ۲- موچھ بیوهار (تدبیر قطع تعلق از مراتب) ۳- اتپت (آغاز نمود جهان) ۴- استھت (بقای نمود عالم) ۵- اپشم (فنای نمود جهان) ۶- نربان (رستگاری از تکرار تنزلات)

آغاز: سپاس و ستایش و تمام نیایش نثار حضرتی ست که ذرات اکوان فروغ یافته، آفتاب حقیقت،

(ن، ک، ریو، ۱: ۶۱ "جوگ باششته" سه نسخه حبیب الله (؟) اته: ۲۹۲۷، "جوگ باشست" ترجمه ۱۹۷۲ و ۱۹۷۱- نسخه ها ۲: ۸۷۰ "جوگ باشست". ذریعه ۴: ۱۲۹ "ترجمه کتاب جوگ" ترجمه نظام الدین برای سلطان سلیم).

۱۱۶۳۳- کراچی، انجمن ترقی اردو اق ف ۵۳: نستعلیق، سکھ ناتھ یا سکھانند ساکن بیانه، بروزگار اورنگ زیب (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ) آغاز افتاده، ۲۵۳ ص،

۱۱۶۳۴- اسلام آباد، گنج بخش ۱۴۹۰: نستعلیق شکسته، هردیال عرف سهنگل ساکن پیشاور، ۲۸ ذیقعده ۲۲ جلوس محمد پادشاه (۱۱۵۲ھ ؟) آغاز برابر نمونه ۱، (ص ۱-۴۵۸) (گنج ۳: ۵۹۴)

۱۱۶۳۵- کراچی، موزه ملی N.M.۵۲۸/۱۰۵: نستعلیق شکسته آمیز، سده ۱۲ھ آغاز و انجام افتاده، ۲۷۱ ص،

۱۱۶۳۶- کراچی، همانجا N.M.۱۹۵۷-۹۱۲/۱۷: شکسته، سده ۱۲ھ، انجام افتاده، ۲۲۰ ص (نوشاهی: ۹۱۲)

۱۱۶۳۷- کراچی، انجمن ترقی اق ف ۵۸: نستعلیق، دولت رای، ۲۵ ذیقعده ۱۲۰۰ھ، ۱۲۴ ص (سرفراز: ۳۷۷، ۳۷۹- نوشاهی)

۱۱۶۳۸- کراچی، موزه ملی N.M.۱۹۷۶-۲۰: نستعلیق، حقیقت رای بن عمل رای میرانی، ۱۹ محرم ۱۲۱۱ھ- ۴۳ ص،

۱۱۶۳۹- کراچی، همانجا N.M.۱۹۵۷-۱۰۷۶: نستعلیق، (مهیرا) لعل، ۱۲۲۰ھ یا ۱۲۴۰ھ، در مرادآباد، ۲۵۷ ص (نوشاهی: ۹۱۲)

۱۱۶۴۰- کراچی، انجمن ترقی اق ف ۵۲: نستعلیق، رای شیوک رام بن رای سکھ راج، ۱۵ شوال ۱۲۳۳ تا ۲۲ محرم ۱۲۲۳ھ، از روی نسخه نوشته ۲۸ شوال ۱۱۶۱ھ، ۲۵۰ ص،

۱۱۶۴۱- کراچی، همانجا اق ف ۵۴: بیارا... محکم سنگھ ساکن رهتک، ۱۶ع۲/ ۱۲۳۹ھ، در اکبرآباد، آغاز افتاده، ۳۷۶ ص (سرفراز: ۳۷۸- نوشاهی)

۱۱۶۴۲- بهاولپور، غلام محمد گھوتوی، محمد عبدالحی چشتی ۱۵۰: نستعلیق پخته، کانشی رام منوچه، ۱۵ مارچ/ ۲۸ ماه پھاگن، ۱۹۷۱ ب (۱۳۳۵ھ) آغاز برابر نمونه، ترجمه محض دارا شکوه، در شش پرکرن، ۱۵۲ ص (دکتر الله دتا چودری).

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مؤلف / مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	[illegible]	سال طباعت	صفحات	سائز	[illegible]	کیفیت
۴	اطوار در حل اسرار [illegible]	[illegible]	مخطوطہ						یہ قلمی نسخہ پاکستان میں ہے دیکھئے فہرست مخطوطات فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ جلد چہارم۔ تفصیل نیچے دیکھئے۔ ۳۸۹۶۔ اطوار در حل اسرار: جوک باشست متن گزیدہ ای ست از "یوگ وشستھا" از کتابھای نامی تصوف کونستیک ہندی، در گفتگوی میان رشی وشست و رامچندر این متن را چند ترجمہ است یکی از پنڈت اننددن رام کشمیری این ترجمہ با مورد پسند اکبر بادشاہ (۹۶۳-۱۰۱۴ھ) قرار نگرفتہ، و در ۱۰۰۶/۹۷-۱۵۹۸م دستور داد کہ یکی از درباریان آنرا بہ فارسی آسان تری

کیفیت

در آورد۔

ترجمہ نہ بیرا ز صوفی شریف خوب جہانی (ن. ک. لطایف صوفیہ، خلاصۃ الاسرار، در ہمین بخش)، از دانشمندان روزگار جہانگیر (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ) و گویا بنام او، یکی از ترجمہ ہای "یوگاواشیستہ: یوک وشست" است. در سیر و سلوک ہند، بسیار روان و شور انگیز، خطاب از "شست" بہ "رامچند" در دہ "طور". در نسخہ گنج بخش بجای نام کسان "ای عزیز" آمدہ است،

طور ۱- یافت و شناسائی حق، تجرید، ۲- در آنکہ عالم محض خیال است، ۳- در بیان آزادی، ۴- در جمعیت دل، ۵- در رفع خواہش جنگلی، ۶- در معرفت یقین، ۷- در معرفت حق، ۸- در دریافت خویش، ۹- در معرفت حال خود، ۱۰- در کمال معرفت حق۔

در نسخہ گنج بخش و چاپ نولکشور ۱۸۸۵م نام مترجم نیامدہ است،

آغاز چاپی: این رسالہ ای ست مسمی بہ اطوار در حل اسرار، بہ تحریر کمالات شست در امچند کہ از راہ طلب و عرفان بہ ظہور رسیدہ، از پردہ بیرون کشیدہ، فارسی یافتہ و از لباسی بہ کسوت دیگر... طور اول. در بیان تجرید، شست می گوید سجدۂ من در تعظیم از دل صمیم برای نور آمدہ، آغاز ۲: حمد و ثنا لایق ذات خدائی است، کہ نقوش علمی و رحمانی حقایق اعیانی ثبت فرمود (نسخہ موزہ)

ن. ک، نسخہ ہا ۱: ۴۴۳۰ "اطوار..." کہ نام مترجم را نیاوردہ ام. مشار ا: ۴۰۷ "اطوار..." کہ از صوفی شریف است و نشانی یک چاپ آن را دادہ. ریو ۳: ۱۰۳۴ "اطوار..." از صوفی شریف، با سر آغاز: حمد و ثنا لایق ذات خداست، کہ از

کیفیت

نفوس۔ ہمانجا ۱ : ۶۱ "جوک باششتہ"۔ پاکستان وہند ۴ : ۷۹۳ "اطوار ..." کہ می گوید سہ ترجمۂ فارسی از آن شدہ یکی بروزگار جہانگیر از صوفی شریف و یکی نیز زیر نظر داراشکوہ در ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵م۔ مرآت العلوم ۲ : ۱۳۰ "اطوار ..." از صوفی شریف۔ اتہ : ۱۹۷۲ "اطوار در حل اسرار یا تحفۂ مجلس" از صوفی شریف)

۱۱۶۴۳۔ کراچی، موزہ ملی ۱۶۱ - ۱۹۷۳ . N.M : نستعلیق، ۲۵ ج ۲/۱۱۸۹ھ، ۴۴ ص۔

۱۱۶۴۴۔ کراچی، ہمانجا N.M.414-B : نستعلیق شکستہ آمیز، ۱۲ع ا/سدہ ۱۲، از طور ۳ تا ۱۰ را دارد، ۱۸ ص (نوشاہی : ۹۱۲)

۱۱۶۴۵۔ اسلام آباد، گنج بخش، ۴۸۳ : نستعلیق ریز، سدہ ۱۲-۱۳ھ، (ص ۸۱-۹۵) دیباچہ را ندارد، آغاز : بسملہ۔ بدانکہ ای درویش سجدہ من و تعظیم من از صمیم دل برای نوری آمدہ کہ دایم بریک قرار است (گنج ۲ : ۵۵۸)

۱۱۶۴۶۔ لاہور، پنجاب پبلک لائبریری ج ۵، ۲۹۴ جوک۔ شری ۳، ۴۹ ادارا: سہ شنبہ ۲۵ رمضان ۱۲۳۱ھ، در فہرست آمدہ "اطوار در حل اسرار یا جوک بششت" ترجمہ از ناشناس، وردہ بخش، عنوان ہا فانویس، آغاز : ابتدای ہر صحیفہ عنوان بنام نامی شری مہاراج صاحب کہ خالق کون و مکان است، ۱۶ک (عباسی ۱ : ۲۵)

۱۱۶۴۷۔ لاہور، کتاب خانۂ عمومی پنجاب ج ۵، ۲۹۴ جوک شری : نوشتہ شنبہ ۲۵ رمضان ۱۲۳۱ھ، آغاز برابر نمونہ، در فہرست بنام "اطوار در حال (ا) اسرار، یا جوک بشست" آمدہ، ۱۹۰ک (عباسی ۱ : ۲۳)

۱۱۶۴۸۔ لاہور، دانشگاہ، شیرانی ۱/۲۱۰۰/۵۱۱۲ : دھالورام گکر، در

کیفیت

ملتان، ۱۴ بوہ ۱۹۰۵ ب/۱۸۴۸م (۱۲۶۴ھ) در فہرست بنام "جوگ باششت یا اطوار در حل اسرار" آمدہ (بشیر حسین ۳ : ۶۷۴)

۱۱۶۴۹۔ لاہور، ہمانجا ۴/۲۰۹۲/۵۱۰۵ : نوشتہ بھوانی پرشاد، ۱۸۵۵م (۱۲۷۲-۱ھ) در لاہور (بشیر حسین ۳ : ۶۷۴)

نمبر شمار	[illegible]	[illegible]	مخطوطہ یا مطبوعہ	[illegible]	[illegible]	صفحات	سائز	[illegible]	کیفیت
۵	[illegible]		مخطوطہ	×	×	×	×	×	قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے جلد چہارم مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان فہرست خطی فارسی، تفصیل نیچے ہے ۳۸۹۷۔ مفرح القلوب: ترجمۂ جوگ بششت متن ہمان۔ ترجمۂ از ناشناس۔ ن، ک، مفرح القلوب در ہمین بخش) آغاز : پس از نیایش جناب کریم متعال، مترجم فرح (فرغ) البال می گوید، کہ جوگ بششٹ عبارتیشی موسم بہ موکی پای، یعنی نامی نامہ ای ست مشتمل بر ارشاد حق ایزدی و رستگاری۔

نمبر شمار	نام یوگ واشسشٹھ	نام مصنف یا مترجم/مولف	مخطوط یا مطبوعہ	تاریخ مخطوط	نام کاتب یا سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
									۱۱۶۵۰۔ کراچی، موزہ ملی ۲۱۴۔ N.M.1969: نستعلیق، سدۂ ۱۲ھ، ۲۵۸ص (نوشاہی: ۹۱۳)
۶	جوگ باشست ترجمہ	×	مخطوط						قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے فہرست خطی فارسی مرکز تحقیقات ایران وپاکستان جلد چہارم۔ تفصیل نیچے ہے۔ ۳۸۹۸۔ جوگ باشست ترجمہ، متن ہمان، ترجمہ ناشناختہ، ۱۱۶۵۱۔ کراچی، موزہ ملی ۵۲۸/۸۰۔ N.M: نستعلیق، سدہ ۱۲ھ، آغاز وانجام افتادہ، ۱۳۸ص (نوشاہی: ۹۱۳)
۷	ویراگ پرکرن سری باشست جی	×	مخطوط						قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے فہرست خطی فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان جلد چہارم، یہ ویراگ پرکرن جوگ واشسشٹھ کا پہلا پرکرن ہے اسے الگ سے لکھا گیا ہے۔ ۳۹۷۰۔ ویراگ پرکرن سری باشست جی بہندی وفارسی، بامقدمہ ای کہ خلاصۂ

کیفیت

کتاب را بہ فارسی آوردہ است،

آغاز: اتہہ ویراک ہرکرنی سیرون سمت سمرت بہا کیا لکھی ست آنند روپ چوانمان۔

۱۱۸۹۷۔ بہاولپور، سنترال لائبریری ۱۴۹: نستعلیق تحریہ آمیز، بامضای بندہ جمنونداس، کہ بہ خط نولیسندہ می خوردو، تاریخ یادنشدہ، باے تصویر زیبا در موضوع عقاید ہند باستان، ۳۰۶ص (دکتر اللہ دتا چودری)

نمبر شمار	نام یوگ واشسشٹھ	نام مصنف یا مترجم/مولف	مخطوط یا مطبوعہ	تاریخ مخطوط	نام کاتب یا سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۸	جوگ باشست ترجمہ	دارا شکوہ	مخطوط	۲۳ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ					دیکھئے صفحہ ۴۵۴/۴۵۵ CONCISE DESCRIPTIVE CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS ASIATIC SOCIETY BENGAL 1926. یہ الگ قلمی نسخہ ہے۔
۹	[illegible]	[illegible]	مخطوط	[illegible]					دیکھئے صفحہ ۴۰۶ فہرست مخطوطات شیرانی جلد سوئم ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور۔ یہ الگ قلمی نسخہ ہے جو پاکستان میں ہے۔

نمبر شمار	نام یوگ واشسٹھ	نام مصنف / مولف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	تاریخ تصنیف / سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۰	جوگ بسشٹ مع ترجمہ اردو [illegible]	کشور [illegible]		۱۸۵۵ء					شرح صدر
۱۱	ترجمہ جوگ بسشٹ	نظام پانی پتی [illegible]	"						دیکھئے صفحہ ۲۷۷ CONCISE DESCRIPTIVE CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS OF ASIATIC SOCIETY CALCUTTA — 1985.
۱۲	"	محمد داراشکوہ [illegible]		۱۰۹۰/۱۶۷۹					شرح صدر
۱۳	"	نظام پانی پتی (؟)							دیکھئے صفحہ ۶۹ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی۔ بمبئی کتاب خانہ موسسۂ کتاب گنجینۂ مالکنجی۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
۱۴	یوگ واشسٹھ			۱۹۱۶A.D			۱۹ ۱/۲ × ۸		یہ قلمی نسخہ آرکائیوز پنجاب پٹیالہ میں ہے۔ مخطوط کا نمبر ۹۰۷ ہے۔

نمبر شمار	نام یوگ واشسٹھ	نام مصنف / مولف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	تاریخ تصنیف / سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۵	یوگ واشسٹھ						۱۵×۱۰		یہ قلمی نسخہ آرکائیوز پنجاب پٹیالہ میں ہے۔ مخطوطہ کا نمبر ۵۳۵ ہے۔
۱۶	جوگ باشسٹھ			AH 1150 / 1744 A.C.					دیکھئے صفحہ ۸ لسٹ عربی اینڈ پرشین مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ AN EXPOSITION OF HINDU GNOSTICISM IN THE FORM OF A DIALOGUE BETWEEN RISHI VASHISHTA AND RAM CHANDRA TRANSLATED FROM THE SANSKRIT INTO PERSIAN - COMPLETE.
۱۷	جوگ بسشٹ	شیخ [illegible]	قلمی						دیکھئے ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب۔ عہد جہانگیر سے عہد اورنگزیب تک" صفحہ ۲۶۷
۱۸	منتخب الفوائد (؟) [illegible]		قلمی						کتاب خانہ دانشگاہ تہران جلد سوئم پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۲۷۹

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف مترجم	مطبوعہ یا قلمی	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۳۵	الکواہ و جیل ابرار ترجمہ جوگ بششٹ		قلمی						نسخہ ہائے خطی فارسی کلچرل ہاؤس ایران جلد چہارم
۳۶	ترجمہ جوگ بششٹ		قلمی						یہ نسخہ الگ ہے۔
۳۷	ترجمہ جوگ بششٹ	داراشکوہ	قلمی						دیکھئے نسخہ ہائے خطی فارسی ۲۱۴۹ صفحہ
۳۸	مفرح القلوب ترجمہ جوگ بششٹ	ناشناس	قلمی						" " " ۲۱۵۱ صفحہ
۳۹	ترجمہ جوگ بششٹ		قلمی						" " " ۲۱۵۲ صفحہ
۴۰	ترجمہ جوگ بششٹ		قلمی	۱۸۵۰		۱۵۸			فہرست نسخہ ہائے قلمی اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ صفحہ ۱۵
۴۱	یوگ واششٹ		مطبوعہ						فارسی ترجمہ اشتہار خازمی بک سیلرز بمبئی۔ قیمت -/۲۴۰
۴۲	ترجمہ یوگ واششٹ	×	قلمی						تھوڑا فرق ہے MSS نمبر ۱۷۰۰ بشرح صدر
۴۳	منہاج السالکین ترجمہ جوگ بششٹ	مولانا ابوالحسن فرید آبادی							دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔
۴۴	ترجمہ یوگ واششٹ					۱۱۱			دیکھئے مرآۃ العلوم جلد دوم خطی فارسی خدابخش لائبریری پٹنہ

اردو میں یوگ واششٹھ

نمبر شمار	نام یوگ واششٹھ	نام مصنف مولف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	نام پریس سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	ترجمہ جوگ واششٹھ	سوامی دیال کایستھ	مطبوعہ دو جلدوں میں	×	نولکشور لکھنؤ تیسری بار دسمبر ۱۹۰۵ء	پہلی جلد ۵۱۶ دوسری جلد ۵۴۷	جہازی	منثور	کتب خانہ نابھوی میں ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ نولکشور پریس کا دو جلدوں میں بھی کتب خانہ نابھوی میں ہے۔
۲	الکھ امواج ترجمہ جوگ بششٹ	کنھیالال الکھ دھاری		۱۸۷۵ء		۲۱۳			یہ قلمی نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے۔ دیکھئے ہندوستان کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات مرتبہ خدابخش لائبریری
۳	برھما گیان ترجمہ جوگ بششٹ	گورسہائے لال							بشرح صدر
۴	منہاج السالکین	ابوالحسن			نولکشور پریس ۱۹۰۷	۳۲۲			یہ نول کشور پریس سے چوتھی بار شایع ہوئی۔ دیکھئے صفحہ ۴۴۴ نیشنل ببلیوگرافی آف انڈین لٹریچر ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۱۹۵۳-۱۹۰۱
۵	جوگ بششٹ		مخطوطہ						یہ سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں نمبر ۳۵۸ درج ہے۔
۶	جوگ بششٹ		مخطوطہ						" " " ۳۵۹ درج ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مولف / مترجم	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ کتابت / تاریخ طبع	سال طباعت / نام مطبع	صفحات	سائز	منظوم / منثور	کیفیت
۷	یوگ وششٹھ یوگ واششٹھ	[illegible]	مطبوعہ		نول کشور ۱۹۰۵-۱۹۰۷	۵۱۴/۵۳۴	جناتی	منثور	نابھوی کتب خانہ میں ہے۔
۸	یوگ وششٹھ یوگ واششٹھ	[illegible]	مطبوعہ			۲۸۸	کتابی	منثور	" " "
۹	یوگ وششٹھ یوگ واششٹھ	[illegible] سہائے	مطبوعہ						پٹیالی یونیورسٹی پٹیالہ۔ موہن سنگھ کلکشن میں ہے۔
۱۰	یوگ وششٹھ یوگ واششٹھ	منوہر لال	مطبوعہ						بشرح صدر
۱۱	[illegible] یوگ وششٹھ		مطبوعہ						بشرح صدر
۱۲	جوگ بششٹھ		مطبوعہ		۱۸۶۹ء گلزار ہند	۳۲۲			میونسپل لائبریری پٹیالہ میں ہے
۱۳	منہاج السالکین جوگ بششٹھ	[illegible]	مطبوعہ		۱۸۸۶ء [illegible]				فہرست کتب خانہ پبلک لائبریری پنجاب لاہور اردو ۱۹۳۶ء صفحہ ۳ اور (فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد)
۱۴	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ		گوجرانوالہ				بشرح صدر صفحہ ۱۸۱

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مولف / مترجم	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ کتابت / تاریخ طبع	سال طباعت / نام مطبع	صفحات	سائز	منظوم / منثور	کیفیت
۱۵	یوگ واششٹھ مختصر خلاصہ	یوگی [illegible]	مطبوعہ		لاہور ۱۹۳۰ء				بشرح صدر صفحہ ۱۸۷
۱۶	منہاج السالکین ترجمہ جوگ بششٹھ	سوامی دیال	مطبوعہ		نولکشور				پبلک لائبریری لاہور فہرست صفحہ ۱۸۱۔
۱۷	المعراج ترجمہ یوگ بششٹھ								اشتہار مہابھارت سری رام کرت صفحہ ۱۳۹ اور مقالات گارساں دتاسی جلد دوئم صفحہ ۲۲۳۔
۱۸	المعراج ترجمہ یوگ بششٹھ	محبوب لال [illegible]			۱۸۴۰ء	۳۱۴			دیکھئے فہرست مخطوطات اردو جلد اول خدابخش لائبریری پٹنہ

حکمائے اسلام (حصہ اول و دوم)

از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

دونوں جلدوں میں یونانی فلسفہ کے تاریخی مآخذ، علوم عقلیہ کی اشاعت کی مختصر اور متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، نظریات اور خدمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

قیمت حصہ اول: ۳۳ روپیے

قیمت حصہ دوم: ۲۵ روپیے

"منیجر"

وفیات

مولانا حافظ محمد تقی امینی

از ضیاء الدین اصلاحی

ڈاک کا نظام اس قدر ابتر ہے کہ مہینوں سے دار المصنفین میں اردو کا کوئی اخبار نہیں آرہا ہے اس لیے ضروری اور اہم خبروں کا بھی علم نہیں ہوتا، پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جن کے گرامی نامہ سے دار المصنفین کے ایک مخلص کرم فرما مولانا حافظ محمد تقی امینی کی حسرتناک وفات کی اطلاع تاخیر سے ملی۔

مولانائے مرحوم مسلمانوں کے قدیم و جدید دونوں طبقوں میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی، وہ ایک عالم دین اور اسلامیات کے فاضل و محقق اور مصنف کی حیثیت سے پورے ملک میں مشہور تھے، دینی علوم میں بلند پائیگی کے ساتھ ساتھ وہ اخلاص، عمل، للّٰہیت، بے نفسی اور زہد و اتقا میں بھی ممتاز تھے، ان کی وفات سے علمی و دینی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

۱۹۵۰ء میں میں عربی کا مبتدی تھا اور اسی زمانے سے معارف کی ورق گردانی کرتا تھا، اس کے جن مضمون نگاروں کے نام لوحِ دل پر ثبت ہو گئے تھے ان میں مولانا

کا نام بھی تھا کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد برابر ان کے مضامین معارف میں شایع ہوتے رہتے تھے، سنہ تو یاد نہیں لیکن ان سے پہلی ملاقات دار المصنفین میں اس وقت ہوئی جب وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات سنی کے ناظم ہو چکے تھے اور گرمیوں میں مطالعہ و کتب بینی کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائے تھے۔

وہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دار المصنفین کے مہمان تھے جن کے ساتھ ہی میرا کھانا پینا بھی ہوتا تھا، شاہ صاحب نے مولانا کا پلنگ میرے کمرے میں لگوا دیا تھا اس طرح تقریباً ایک ماہ تک ہر وقت میرا ان کا ساتھ رہا اور مجھے ان سے فیض یاب ہونے اور ان کے مخلصانہ مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملا۔ مولانا بڑے خوش طبع اور باغ و بہار شخص تھے، اپنی دلچسپ باتوں اور لطائف و ظرائف سے معمور گفتگو سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے ان کی صحبت میں بہت جی لگتا اور یہ چند روز بڑے پُرکیف اور نہایت خوشگوار گذرے،

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے   آں شب قدر کہ تازہ براتم دادند

اس ملاقات کے بعد مولانا سے خلوص و محبت کا جو رشتہ قائم ہوا وہ اب ان کی وفات کے بعد ہی ختم ہوا، میں جب علی گڈھ جاتا تو ان سے ضرور ملاقات کرتا، وہ بہت خوش ہوتے اور میں بھی ان سے ملنے کو ملاقاتِ مسیحا و خضر سے بہتر خیال کرتا، کسی جلسہ اور سیمنار میں ملتے تو برابر اپنے ساتھ رکھتے اور فرماتے ع غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو۔

وہ خطوط کم لکھتے تھے مگر جب کبھی ان کو جواب طلب خط لکھا تو اس کا جواب فوراً دیا، ان کی کوئی کتاب چھپتی تو ضرور بھجواتے اور خط لکھ کر تبصرے کا تقاضا کرتے، فرماتے کہ اب دو ہی ایک رسالوں میں کتاب پڑھ کر تبصرہ ہوتا ہے معارف کے بعد مجھے کسی کے

تبصرے کا انتظار نہیں رہتا۔ میری کوئی تحریر پسند آجاتی تو خط لکھ کر حوصلہ افزائی فرماتے، معارف کی ادارت کا بارِ گراں میرے دوشِ ناتواں پر آیا تو دو ایک شمارے ملاحظہ فرمانے کے بعد جو ہمت افزا خط لکھا اس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ حال ہی میں میرا ایک تبصرہ ان کی نظر سے گذرا تو بہت پسند کیا اور فوراً مبارک باد کا خط لکھا جس میں یہ اصرار بھی تھا کہ ان کا خط معارف میں شایع کر دیا جائے۔ جب ملاقات ہوئی تو پھر داد دی اور خط شایع نہ کرنے کے میرے فیصلے سے اتفاق فرمایا۔

مولانا کی ولادت صبیحہ (ضلع بارہ بنکی) میں ۱۹۲۶ء میں ہوئی، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ الٰہیات کان پور میں داخلہ لیا لیکن تعلیم کی تکمیل مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہاں پوری کے سایہ عاطفت میں مدرسہ امینیہ دہلی میں ہوئی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور وقتاً فوقتاً مختلف مدارس سے وابستہ رہے، دار العلوم معینیہ اجمیر کے صدر مدرس بھی رہے، اسی زمانہ میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلما کی دعوت پر موجودہ دور کے اہم، پیچیدہ اور نازک مسائل کا متفقہ حل تلاش کر کے مسلمانوں کی مناسب رہنمائی کے لیے مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، اس مجلس کی ذمہ داری مولانا محمد تقی امینی کو تفویض کی گئی، یہ کام ان کے ذوق اور دلچسپی کا تھا جس کو انھوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا،

ندوۃ العلما لکھنؤ میں چند برس قیام کرنے کے بعد وہ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ آئے اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں لکچرر اور ناظم سنی دینیات مقرر ہوئے اور ترقی کر کے صدر شعبہ سنی دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی ہوئے اور ۸۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ علی گڑھ کو انھوں نے اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا، وفات کے بعد اسی کی خاک کا

پیوند ہوئے اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا کا اصلی کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں، ان میں تصنیف و تالیف کا ذوق فطری تھا، علی گڑھ کی علم پرور فضا میں ان کا یہ جوہر زیادہ کھلا، مختلف موضوعات پر انھوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) کائنات میں انسان کا مقام (۲) عروج و زوال کا الٰہی نظام (۳) لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر (۴) اسلام کا زرعی نظام (۵) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر (۶) مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر (۷) احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت (۸) تہذیب کی تشکیل جدید (۹) انشورنس کی شرعی حیثیت (۱۰) امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات کی روشنی میں (۱۱) مقالات امینی (۱۲) حدیث کا درایتی معیار (۱۳) خطبات عیدین (۱۴) مراسلات (۱۵) حکمت القرآن (۱۶) ہدایت القرآن (نامکمل تفسیر قرآن)

ان کتابوں کی اہمیت کی وجہ سے عربی و انگریزی میں بعض کے ترجمے بھی ہوئے جن لوگوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ مولانا کی علمی و دینی پختگی اور وسعت نظر کی شہادت دیں گے۔

اس زمانہ میں احکام و مسائل اور فقہی جزئیات پر نظر رکھنے والے اشخاص کی کمی نہیں ہے لیکن مسائل پر پھیل کر سوچنے اور غور کرنے والے مفقود ہیں مولانا کی تصنیفات میں جن مسائل کا ذکر ہے فقہ کی قدیم کتابیں ان سے خالی ہیں اور موجودہ لوگوں نے بھی ان کی جانب کم توجہ کی ہے اور جنھوں نے کی ہے ان کے اور مولانا کے انداز فکر میں نمایاں فرق ہے، ان کا تعلق اس صاحب نظر طبقہ سے تھا جو اسلامی فقہ کے جمود و تعطل کو ختم کر کے اجتہاد کا بند دروازہ کھولنا چاہتا تھا، اس سلسلہ میں ان کا

رسا ذہن اور دقیقہ بیں نظر جہاں اور جن گوشوں تک پہنچی ہے وہاں تک رائے عام سے مرعوب اور شذوذ و تفرد کے اندیشوں میں گرفتار لوگ نہیں پہنچ سکے، مولانا کو زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا احساس ہے، اس لیے انھوں نے ٹھیٹ مذہبی حلقوں کو اپنا انداز فکر و نظر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی دعوت دی ہے اور نئی جلوہ گاہوں کے مدہوشوں کو ہوش و حواس درست کرنے اور اجتہاد کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کا مشورہ دیا ہے آج چاہے ان کی رائے کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے لیکن جلد ہی اس کا وزن محسوس کیا جائے گا، انھوں نے بہت پہلے شورائی اجتہاد کو اس دور کے لیے مناسب بتایا تھا اب اس کی اہمیت عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے، غور و فکر، اجتہاد و اختراع اور تفریع و استنباط اس امت کا خاص وصف و امتیاز تھا مسلمانوں کے اسی تاریخی کردار اور کارنامہ کو مولانا نے اپنی تصنیفات میں تفصیل سے قلمبند کیا ہے،

جس طرح مولانا امینی کو اسلامی فقہ و قانون کی تشکیل جدید اور از سر نو تدوین کی ضرورت کا شدید احساس تھا اسی طرح ان کو احادیث کی از سر نو تدوین و تبویب کی ضرورت کا بھی احساس تھا، وہ اس پر غور و فکر تو برابر کرتے رہے مگر فقہ اسلامی کی طرح اس کے متعلق اپنے خیالات کو یا تو پیش کرنے کا انھیں موقع نہیں ملا یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ابھی لوگ ان کے ان خیالات کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔

جس طرح فقہ کی نئی تدوین و تشکیل کا مقصد قدیم فقہا کی خدمات اور کارناموں پر پانی پھیرنا نہیں ہے، اسی طرح حدیث کی نئی ترتیب و تدوین اور اس کے لیے نئے اصول روایت و درایت وضع کرنے کا مقصد بھی احادیث نبوی کا انکار اور قدیم

محدثین کے کارناموں کو نظر انداز کرنا نہیں ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ قدما نے جس انداز پر کتب حدیث مرتب کی ہے اب اس سے سر مو انحراف کو وہ لوگ حدیث کی مخالفت سمجھتے ہیں جو ہر قسم کی تقلید کو ناروا خیال کرتے ہیں۔

مولانا تقی امینی نے "حدیث کا درایتی معیار" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں یہ واضح کیا ہے کہ صحیح و غلط حدیثوں میں امتیاز کے لیے محدثین نے روایت کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کیے تھے لیکن اصول روایت کے مقابلہ میں اصول درایت پر کم توجہ کی گئی خصوصاً اردو میں تو اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے، مصنف نے درایت کا مفہوم اور قرآن مجید، احادیث نبوی اور اقوال صحابہ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کر کے اس بارے میں محدثین کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، فن روایت میں سند حدیث یعنی راویوں کے حالات کی چھان بین کی جاتی ہے، مولانا کے نزدیک یہ خارجی نقد حدیث ہے اور فن درایت میں روایت کے مضمون و متن پر نقد و جرح کر کے اس کی قوت و ضعف کا فیصلہ کیا جاتا ہے، مولانا اسے داخلی نقد حدیث کہتے ہیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ کے وقت اولاً تو تطبیق کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو داخلی (درایت) کو خارجی (روایت) پر ترجیح حاصل ہوگی۔

اس کتاب میں مولانا نے حدیث کی معرفت و درایت کے قدیم اصول و ضوابط کو منضبط کر کے ان کی تشریح اس لیے کی ہے تاکہ درایت کے نئے قواعد و قوانین مرتب کرنے کی راہ ہموار ہو۔ اس کے شروع میں ذات نبوی پر مختلف حیثیتوں سے جو بحث کی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس کا مقصد نبوت و رسالت کی اہمیت اور نبی و رسول کی عظمت کو واضح کرنا ہے، مولانا کے نزدیک شعور نبوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے

اور اس کی وضاحت انھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی
کو من جانب اللہ علم وادراک، فہم وبصیرت اور حکمت ونورانیت عطا ہوتی ہے اور
امور دین سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات وحی الٰہی سے
مستنبط ہوتے ہیں، منصب نبوت، پیغمبرانہ خصوصیات اور نبی کے علم وفہم اور
حکمت وشعور کی یہ مبسوط اور فاضلانہ تشریح اس لیے کی گئی ہے کہ نبوت کے سرچشمہ
فیض سے جاری ہونے والی حدیثوں کی خصوصیت، عظمت اور نوعیت پوری
طرح سامنے آجائے۔

جس طرح فقہ واجتہاد میں مولانا کے بعض خیالات کو شذوذ وتفرد پر
محمول کیا گیا اسی طرح حدیث کے درایتی معیار پر جب ان کی محققانہ کتاب کے
بعض حصے معارف میں چھپے تو طرز کہن پر اڑنے والے بعض لوگوں کو ناگواری ہوئی۔
مولانا کے نزدیک ثقہ راویوں سے منقول مستند کتب حدیث کی روایتیں بھی شان
نبوت کے منافی ہونے کی صورت میں قابل رد ہوں گی، لیکن تاویل وتوجیہہ کے
گورکھ دھندے میں پڑنے والے لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی جو قبول روایت
کا مسلمہ اصول ہے، ان حضرات کو نسخ کے بارے میں بھی مولانا کے اس خیال پر
شرح صدر نہ ہوا ہوگا کہ اس کا تعلق قدیم کتب آسمانی سے ہے نہ کہ قرآن مجید
سے، وہ قرآن مجید کے احکام میں ردوبدل کا تعلق ذات سے نہیں اوصاف سے
بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں
کی نوعیت وحکمت لوگوں پر واضح نہیں ہوسکی اور انھوں نے اسے قرآن کے احکام
میں ردوبدل پر محمول کردیا۔

مولانا تہذیب کی تشکیل جدید کے داعی وحامی تھے اور اس بارے میں بھی انکے
خیالات عام سطح سے بلند اور مختلف تھے، وہ جوہر انسانیت کے تربیتی پروگرام
کے اس خاکہ کی وضاحت اپنی تحریروں میں کرتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے قرآن حکیم کے کلیات پر غور کرکے مرتب کیا تھا، انھوں نے عروج وزوال کے
الٰہی نظام اور کائنات میں انسان کے مقام ومرتبہ کی تشریح بھی اسی لیے کی ہے قرآن
مجید کے خزانہ علم وحکمت کے لعل وگہر کا سراغ لگانے کی کوشش حکمت القرآن
میں کی گئی ہے، یہی حکمت بشریت اور تہذیب انسانی کا اصلی تمغا ہے، دراصل مولانا
دین اور حکمت دین سے واقفیت کے لیے ممتاز تھے اور وہ دین کی اصل حقیقت
وروح اور اس کی حکمت ونورانیت کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن وجدانی مسائل کی
کی تشریح ووضاحت بہت نازک کام ہے اس لیے ان کی بعض چیزیں عام لوگوں
کی فہم سے بالاتر ہوتی تھیں جن کی قدر اہل علم ہی کرسکتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی
اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ مولانا کے بڑے قدرداں تھے،

مولانا تقی امینی نے احتساب کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی ادارۂ
علم وعرفان علی گڑھ سے نکالا تھا لیکن اس کی حیثیت عام اخباروں جیسی نہیں تھی
بلکہ اس میں مولانا کے اہم اور دقیق خیالات پر مشتمل مضامین شایع ہوتے تھے،
اسی میں مختلف استفسارات کے عالمانہ جواب بھی شایع ہوتے تھے جن کا ایک
علحدہ مجموعہ ۱۹۸۶ء میں شایع ہوا تھا جس میں اور مفید باتوں کے علاوہ جماعت
اسلامی ہند کے ایک سوالنامہ کا بڑا حقیقت پسندانہ جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا
ہے کہ مسلمانوں کو قومی زندگی سے علحدہ اور الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی درست نہیں ہے۔

ابتدا میں مولانا کو مناظرہ سے بھی شغف تھا مگر جلد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے البتہ وعظ و تقریر ان کا معمول بن گیا تھا مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جمعہ اور عیدین کے خطبے اہتمام اور پابندی سے دیتے تھے جو بہت مفید اور پُر مغز ہوتے تھے، عیدین کے خطبوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۸۳ء میں شایع کیا تھا، وہ پیشہ ور مقرر نہیں تھے لیکن کبھی کبھی جلسوں میں شرکت کے لیے سفر بھی کرتے تھے۔

فراخدلی، وسیع المشربی، مروت، شرافت، سادگی، اخلاص، دردمندی اور عفو و درگذر ان کی سیرت و اخلاق کا نمایاں جوہر تھا، وہ بڑے مرنج و مرنجاں شخص تھے، سب سے محبت، گرم جوشی اور بے تکلفی سے ملتے تھے اس کی وجہ سے ہر شخص ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا، ان کی سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے سن و سال اور علم و مرتبہ میں کمتر لوگ بھی ان سے شوخ اور گستاخ ہوجاتے تھے، وہ چھوٹوں پر بڑی شفقت فرماتے، ان کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی میں بخل سے کام نہ لیتے، اگر ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنا ہوتا تو اس کے لیے حکیمانہ انداز اختیار کرتے، بات کرنے میں لاگ لپیٹ سے کام نہ لیتے، ہمیشہ صاف اور کھری باتیں کرتے تھے، ان میں بڑی جرأت اور خود اعتمادی تھی، حق بات کہنے میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے، اس کی وجہ سے بعض لوگ ناراض ہوجاتے مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے۔

انھوں نے بڑی نرم اور گداز طبیعت اور دردمند دل پایا تھا۔ وہ ہر ایک کے درد و دکھ کو اپنا درد و دکھ سمجھتے تھے، کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو بے قرار ہوجاتے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی فکر کرتے، ایک برس پہلے یونیورسٹی میں ایک داخلہ کے سلسلہ میں میں کافی پریشان رہا میرا کام تو نہیں ہوا لیکن مولانا اور سید حامد صاحب

سابق وائس چانسلر نے میری مدد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

مولانا جب دارالمصنفین میں میرے ساتھ قیام پذیر تھے تو ایک روز رات میں دس بجے ایک صاحب تشریف لائے جن سے ہم لوگ واقف نہ تھے، میں ان کے سونے کا انتظام کرنے میں لگ گیا، اتنے میں مولانا کو معلوم ہوا کہ نووارد بھوکے ہیں، انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ پہلے ان کے کھانے کا انتظام ہونا چاہیے، اگر یہاں ممکن نہ ہو تو چلو ہم دونوں بازار سے کھانا لائیں، میں نے عرض کیا اس وقت بازار میں کھانا نہیں ملے گا۔ اس وقت یہ صرف چائے اور بسکٹ پر اکتفا کرلیں مولانا نے برہم ہوکر فرمایا اگر ان کی جگہ میں اور تم ہوتے تو ہمارا کیا حال ہوتا، میں لاجواب ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد خیال ہوا کہ محترمی سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے یہاں جو اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے بچا کھچا کھانا ہوگا مولانا مجھے لے کر فوراً ان کے یہاں پہنچے، تھوڑی دیر کے بعد کھانا آگیا اور جب ان صاحب نے کھالیا تو مولانا کی پریشانی اور بے چینی دور ہوئی۔

ان کے نیک اور پاک دل میں کسی کی دل آزاری کا کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا، چند برس پہلے میں قصبہ صبرحد ضلع جون پور کے مدرسہ فاروقیہ کے سالانہ جلسہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا بھی تشریف لانے والے ہیں اور ڈاکٹر محمد صابر نائب مدیر فکر و نظر علی گڑھ کے گھر پر مولانا ہی کے ساتھ میری رہائش کا بھی انتظام کیا گیا ہے، میں نے مذاق میں کہا اب معلوم ہوا کہ علالت کا عذر محض بہانہ ہوتا ہے، آپ یہاں تک چلے آئے اور بیماری مانع نہ ہوئی، فرمایا کہ ڈاکٹر صابر کے اصرار کے سامنے میری کچھ نہ چلی، یہ بیچارے مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی دل شکنی کیسے کرتا۔

ان کی زندگی ریا و نمود اور نمائش و بناوٹ سے خالی تھی، غیبت اور دوسروں کی

عیب جوئی سے ان کو نفرت تھی ان میں کبر و نخوت اور علو و پندار کا شائبہ بھی نہ تھا کبھی سے اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہیں ہونے دیتے، اگر ان کو کبھی اس کا احساس ہو جاتا کہ انکی کسی بات سے دوسرے کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ بے تکلف اس سے اسی وقت معافی مانگ لیتے، اپنی غلطی سے رجوع کر لینے میں ان کو تامل نہیں ہوتا تھا۔

ایثار، صبر اور قناعت ان کا شیوہ تھا، اپنے حال میں مست رہتے اور صبر و شکر سے گذر بسر کرتے، ان کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی، اہلیہ کو دماغی فتور تھا مگر کبھی وہ حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

مولانا عرصہ سے علیل تھے، نقرس کی تکلیف کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے، لکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا، میں نے اور لوگوں کی طرح ان سے بھی مضمون کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ اب اسے بھول جاؤ، اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا تھا وہ لے چکا۔ بالآخر ۲۱ جنوری کو پیام اجل آگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

اس قحط الرجال میں مولانا جیسے صاحب علم و نظر اور بلند پایہ عالم دین کا اٹھ جانا قوم و ملت کا بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کرے، مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

بزم رفتگان حصہ دوم

اس کتاب میں بعض ارباب سیاست و اصحاب علم مثلاً پنڈت نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، شاہ معین الدین ندوی، ڈاکٹر فریدی، ہمایوں کبیر، ڈاکٹر محمد اسحاق، سید نجیب اشرف ندوی، ماہر القادری، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں وغیرہ پر مولف کے تاثراتی مضامین یکجا ہیں۔

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن قیمت ۳۳ روپیے

مطبوعات جدیدہ

۱۔ حمد و نعت ۲۔ کاروان حرم از جناب ابوالامتیاز ع، س مسلم، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہترین صفحات (۱) ۲۶۳ (۲) ۳۰۷، قیمت (۱) ۸۰ روپیے (۲) ۱۰۰ روپیے، پتہ: مقبول اکیڈمی ۱۹۹ سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور پاکستان۔

حمد و نعت اردو شاعری کی مقدس اصناف ہیں ہر دور کے شعرا اس سعادت سے بہرہ ور ہوتے رہے ہیں، گذشتہ چند برسوں سے پاکستان میں خاص طور سے اس پر توجہ دی جا رہی ہے، چنانچہ جن شعرا کو خلعت قبول حاصل ہوئی ان میں جناب ابوالامتیاز ع س مسلم بھی ہیں، زیر نظر دونوں مجموعے ان کے قلب و نظر کی طہارت و لطافت اور فن شاعری پر قدرت کا نمونہ ہیں، پہلے مجموعہ میں حمد و مناجات کے باب میں ۱۱۳ اور حصہ نعت میں ۲۲ منظومات شامل ہیں، آخر میں ۶ سلام بھی ہیں، نعتیہ مضامین میں اپنی قلبی واردات و کیفیات کے بیان میں انھوں نے ادب، احتیاط، سلیقہ اور ہوش مندی کے سررشتہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اشعار میں بعض غریب و ثقیل الفاظ جیسے غنام، اطاق، یوم استفتاح، شقاق، مرزع تشکیک، مستطر و نبل باطل، نور استصباح اور ہندی الفاظ جیسے پنچھی، پرنام، داتا، دین دیال، نیل گگن، مہکار اور روپ وغیرہ کو انھوں نے بڑے سلیقہ سے استعمال کیا ہے، شروع میں بعض اہل قلم کی تعارفی تحریریں

بھی ہیں، دوسرا مجموعہ کاروان حرم الموسوم بہ مثنوی مسلم، ایک منظوم سفرنامہ حج ہے، مسلم صاحب ارض حرم کی زیارت پہلے بھی کر چکے تھے مگر ۸۳ھ میں جب وہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تو جذبہ واحساس کی آتش خموش پر قابو نہ پا سکے، نیز تاریخی واقعات کے استحضار نے اس مبارک منظوم سفرنامہ میں دوآتشہ کا لطف پیدا کر دیا۔ فہرست مندرجات میں آل ابرہہ، تحویل قبلہ، تعمیر کعبہ، امتحان ابراہیمؑ، بدر، احد، جنت البقیع، بیعت رضواں، فتح مکہ، سفر مدینہ، داخلہ مدینہ منورہ، مسجد قبا وغیرہ عنوانات سے منظوم سفر کی روداد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، تقریباً ایک ہزار اشعار کے اس مجموعہ کا ہر شعر پُرتاثیر ہے، مثنوی میں کہیں تو مسدس حالی اور کہیں اقبال کے افکار کی چھاپ نظر آتی ہے، آغاز میں جناب احمد ندیم قاسمی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی کی تحریریں تحسین سخن شناس کا عمدہ نمونہ ہیں، ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ اشعار کی تائید میں آیات واحادیث شریفہ کے حوالے مع اردو ترجمے کے دیئے گئے ہیں، اردو کے ادبی ذخیرہ میں یہ دونوں مجموعے اپنی پاکیزگی اور لطافت کے لحاظ سے ممتاز خیال کیے جائیں گے۔ (ع ص)

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت : دار المصنفین اعظم گڈھ　　پتہ : دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت : ماہانہ　　نام پبلشر : " " "

نام پرنٹر : عتیق احمد　　اڈیٹر : ضیاء الدین اصلاحی

قومیت : ہندوستانی　　قومیت : ہندوستانی

نام وپتہ مالک رسالہ : دار المصنفین اعظم گڈھ

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں عتیق احمد

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱. سیرۃ النبی جلد سوم. معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/-

۲. سیرۃ النبی جلد چہارم. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/-

۳. سیرۃ النبی جلد پنجم. فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۲۸/-

۴. سیرۃ النبی جلد ششم. اسلامی تعلیمات، فضائل ورذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/-

۵. سیرۃ النبی جلد ہفتم. معاملات پر مشتمل متفرق مضامین ومباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/-

۶. رحمت عالمؐ. مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ۶/-

۷. خطبات مدراس. سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے ۱۶/-

۸. سیرت عائشہؓ. حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات ومناقب وفضائل۔ ۲۵/-

۹. حیات شبلیؒ. مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/-

۱۰. ارض القرآن ح ۱. قرآن میں جن عرب اقوام وقبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/-

۱۱. ارض القرآن ح ۲. بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/-

۱۲. خیام. خیام کے سوانح وحالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/-

۱۳. عربوں کی جہازرانی. بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/-

۱۴. عرب وہند کے تعلقات. ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۳۹/-

۱۵. نقوش سلیمانی. سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/-

۱۶. یادرفتگان. ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/-

۱۷. مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/-

۱۸. مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/-

۱۹. مقالات سلیمان (۳) مذہبی وقرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/-

۲۰. برید فرنگ. سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۳۰/-

۲۱. دروس الادب حصہ اول ودوم. جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۴/- ۶/-

"منیجر"